سلسلۂ مطبوعاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو شمارہ (۶۳)

انوار

علی اختر

۱۹۴۱ء - مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن -

ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر - رفعت منزل - خیریت آباد

فہرست

تجلیات ۱۴۹

جناب ڈاکٹر زورؔ کے نام

ان کی علمی اور ادبی کاوشوں کے اعتراف میں

علی اخترؔ

دیباچہ

میرے بعض دوستوں کو میرے اس مجموعے پر یقیناً تعجب ہوگا۔ "علی اختر اور غزلیں" شاید اُن کو کچھ بے تکی سی بات نظر آئے گی۔ باور کیجئے کہ تعجب تو اس پر خود مجھے بھی ہے۔ کیونکہ اس مجموعے میں بیشتر وہ غزلیں ہیں جنھیں میں نے کبھی کبھی زندگی کی سنجیدگی سے اُکتا کر یا پھر مشاعروں میں تفریح کے لئے کہا تھا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ مجھے اپنے کلام کی اشاعت کے سلسلہ میں سب سے پہلے اُنھیں کی اشاعت اور ترتیب کرنی پڑے گی۔

اصل یہ ہے کہ میرے بعض احباب سے گوارا نہ کر سکے کہ ان اچھی خاصی غزلوں کو خواہ مخواہ ضائع کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ بہر حال میری کہی ہوئی ہیں۔ بات یوں آپڑی تھی کہ میں ان کی اس خواہش کی تردید کی آزادی سے بھی محروم ہو گیا اور میرا کام صرف یہ رہ گیا کہ میں ان پر ایک نظر ڈال لوں۔

مجھ پر بعض مشہور غزل گو حضرات کو یہ سوءِ ظن بھی ہے کہ میں غزل گوئی کا مخالف ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی موجودہ فضا میں غزل گوئی اور اس کے محدود زاویئے ہر صاحبِ عقل پر گراں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مفہوم یقیناً نہیں ہے کہ غزل بجائے خود شاعری میں کوئی مرتبہ نہیں رکھتی۔ غزل گوئی حقیقت میں شاعری کا ایک نہایت نازک اور مشکل مقام ہے۔ جب تک جذباتِ انسانی کے

عمیق گوشوں پر نظر نہ ہو غزل کی سطح سے گذرنا بہت دشوار ہے۔ بہر حال غزل
کی حمایت کا میری طرف سے یہ عملی ثبوت ہے۔

اس مجموعے میں جس قدر غزلیں طبع ہو رہی ہیں ان میں سے بیشتر وہی ہیں
جو میں نے سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۸ء اور سنہ ۲۰ء تک کہی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یہاں
حیدرآباد میں بھی خاص خاص مشاعروں کی گرما گرمی تھی اور مشہور سخن گو حضرات بھی جمع
تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے بھی اپنی زندگی پر زندگی کی بدگمانی تھی۔
وہ دَور گذر گیا۔ وہ لوگ کچھ تو دنیا ہی سے رخصت ہو گئے اور کچھ باہر چلے گئے۔
اس لئے پھر مجھے غزل کہنے کا بہت کم موقع ملا اور میں قطعی طور پر نظموں کی جانب متوجہ ہو گیا۔
چونکہ یہ غزلیں یادگار ہیں اس زمانے کی جب میں زندگی کی ان تلخیوں سے نا آشنا تھا
اس لئے میں نے اکثر غزلوں میں کوئی ترمیم نہیں کی لیکن پھر بھی دو ایک شعر
بڑھا گھٹا کر اپنے خاص اندازِ بیان کو واضح کر دیا ہے۔

نظم کی طرح میں غزل میں بھی کسی حد بندی کا پابند نہیں ہوں اس لئے ان
حضرات کو تو یقیناً مایوسی ہو گی جو بولی ٹھولی، محاورے اور فن کو شعر سمجھتے ہیں
لیکن جو حضرات شعر کی غیر محدود فضا کی دلآویزیوں سے آگاہ ہیں ممکن ہے کہ یہ
مجموعہ ان کی تسکینِ ذوق میں کار آمد ثابت ہو۔

علی اختر

حیدرآباد دکن

اے خالقِ ہر جُزو و کل و ارض و سما
اے مطلبِ آیاتِ بقا رازِ فنا
یہ "جُزو پیمبریؑ" ہے بخششِ تیری
تو نے ہی مجھے دیدۂ بینا بخشا

عہ شاعری جُزویست از پیغمبری ۔

سرورِ کونین

وہ دیکھ فضائے ہستی میں انوار کا اک طوفاں اُٹھا
وہ حُسن کی بارش ہونے لگی وہ ابرِ ضیا افشاں اُٹھا
ساقی نے سجائے جام وسبو بادل اُمڈے کلیاں چٹکیں
اک شورِ صلائے عام سرِ صہبا کدۂ عرفاں اُٹھا
شب ختم ہوئی تارے ڈوبے گردوں کے دریچے کھلنے لگے
پیغامِ طرب دینے کے لئے پیکِ سحرِ خنداں اُٹھا
آئیں وہ، تلاشِ حُسنِ ازل کا سوز ہے جنکے سینے میں
پردہ تھا جو تیرے جلووں پر اے انجمنِ امکاں اُٹھا
بیدار ہے روحِ آسائش اب بزمِ جہاں نورانی ہے
وہ دورِ غم افزا ختم ہوا وہ صبر شکن ساماں اُٹھا

ہر فتنہ گرِ محرومِ یقیں کا خرمنِ ہستی جلنے لگا
اک برق سی چمکی پیشِ نظر اک شعلہ سرِ داماں اُٹھا
تعمیرِ چمن کی جاتی ہے مہکے ہوئے جھونکے آتے ہیں
پنہاں تھے جو بطنِ فطرت میں وہ غنچے کھلتے جاتے ہیں

(۲)

اے دہر مبارک ہو تجھ کو فردوسِ طرب کی جلوہ گری
پھولوں کی فضا نغموں کا فسوں ہر موج رواں ہر شاخ ہری
اب عقل ہے خود رازِ عرفاں چلتی ہے نسیم امن و اماں
دم توڑ رہی ہے خود بینی خاموش ہے نبضِ فتنہ گری
اقبالِ ظفر مندی نے اُلٹ دی بڑھ کے بساطِ ناکامی
احساسِ جواں سالی میں ہوا تبدیل غمِ پیرانہ سری
عرفانِ حقیقت نے بخشا غفلت کو شعورِ بیداری
اربابِ صداقت نے پایا خطرات میں درسِ بے خطری
آئینِ غلامی نے سیکھے اندازِ کمالِ آزادی
گم کردہ رہی نے روشن کی قندیلِ مقامِ راہبری

تعمیرِ کرم پر ختم ہوئی یارانِ جفا کی خونریزی
تعلیمِ خرد کے کام آئی اربابِ جنوں کی جامہ دری

(۳)

اے کون و مکاں کے رازِ شرف، اے بادشہِ دین و دنیا
روشن ہے تری ذاتِ عالی سے انجمنِ اوجِ بشری
کافی ہے اسے نسبت تجھ سے کچھ اور نہ ہو گر دنیا میں
اے کاش زمانہ کر سکتا احساسِ حجابِ کم نظری
رخشاں ہے تجلّی سے تیری تاریک زمیں کی پیشانی
عنوان ہے تیری ہستی کا تکمیلِ حیاتِ انسانی

(۲)

دل و چشمِ بینا عطا کر رہا ہوں
حقائق کی دنیا عطا کر رہا ہوں

زمانے کے ہر خار و خس کی جبیں کو
محبت کا سجدا عطا کر رہا ہوں

وہ حسنِ خود آرا کہ ہے رازِ ہستی
وہ حسنِ خود آرا عطا کر رہا ہوں

اِن اجزائے ہستی کی بے چینیوں کو
مزاجِ شکیبا عطا کر رہا ہوں

پرانے ہوئے ظرفِ میخانہ ساقی
نئے جام و مینا عطا کر رہا ہوں

جو کوہِ گراں کی جڑوں کو ہلا دے
وہ دل وہ ارادا عطا کر رہا ہوں

جو خود حسنِ پنہاں کو بیچین کر دے
وہ ذوقِ تماشا عطا کر رہا ہوں

جوانی محبت ہا محبت جوانی
بقدرِ تمنّا عطا کر رہا ہوں

قدم لے مرے اے جہانِ خرابی
مئے و حسن و نغما عطا کر رہا ہوں

زمانے کو اب کیا تمنا ہے اختؔر
محبت کی دنیا عطا کر رہا ہوں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی

سحر کے رُخ پر تری صباحت، شفق کے دامن میں نور تیرا
پہنچ گیا، بزمِ آب و گل میں پیام نزدیک و دور تیرا

حریمِ گلشن میں تاقیامت چراغ جلتا نہ رنگ و بو کا
نگارِ فطرت کے خال و خد میں نہ مسکراتا جو نور تیرا

مرے ہر آنسو میں اک تجلی، ہر آہ میں میری ایک نغمہ
کہ ہے مرے دل کی جنبشوں میں تری لطافت سرور تیرا

تری کچھ اس میں خطا نہیں ہے مجھے کچھ اس کا گلہ نہیں ہے
کہ بے نیازِ نیاز مندی رہا ہمیشہ غرور تیرا

ہنوز خوابیدہ تھی جوانی، جو چھڑ گیا سازِ لن ترانی
مگر مری ناتمامیوں کو سمجھ رہا تھا شعور تیرا

زہے تمنائے مئے پرستی، خوشا ہجومِ سرور و مستی
کہ اب مرے عجز کی جبیں پر جھلک رہا ہے غرور تیرا

میں تیرے عشووں سے آشنا ہوں یہ رازِ پنہاں سمجھ رہا ہوں
کہ میری اس نازشی میں بھی ہے کوئی اشارہ ضرور تیرا

یہ دل نہیں اخترِ حزیں کا جسے حوادث نے توڑ ڈالا
بھری تھی جس میں مئے حقیقت وہ جام ہے چور چور تیرا

(۴)

اک فریبِ جلوہ ہی جلوہ بے حجاب اُنکا
کھیلتا ہے نظروں سے عشق کی شباب اُنکا

یا مری نظر ہے یا حُسن ہے نقاب اُنکا
عالمِ تجلّی ہے عالم حجاب اُن کا

دل کی آرزو کی تھی دردِ بے دوا پایا
کیا سوال تھا میرا اور کیا جواب اُنکا

عشق کی لطافت کو خاکِ طور کیا جانے
مجھ پہ بھی نظر اُن کی مجھسے تھا خطاب اُنکا

عالمِ تمنا ہے خواب کا سا اک عالم
شوقِ ناتمام اپنا عشوہ کامیاب اُنکا

کم نہ تھی قیامت سے صبح آفرینش بھی
میری مضطرب نظریں اور انتخاب اُنکا!!

بن گئی اک افسانہ ہر حقیقتِ پنہاں
عشق کو مبارک ہو اُٹھ گیا نقاب اُنکا

موجِ لالہ و گل میں نورِ ماہ و انجم میں
گرمِ رقص ہے اختر جلوۂ شباب اُن کا

(۵)

بہار اُڑا لے گئی ہے شاید تبسم بے حجاب تیرا
کہ موجِ گل کی لطافتوں میں جھلک رہا ہے شباب تیرا

جنونِ وارفتگی سلامت رہے گا اُٹھ کر نقاب[1] تیرا
وہ دیکھ جنبش ہوئی لبوں میں وہ مسکرایا عتاب تیرا

کہا نہ تھا بے حجابیاں ہی کہیں "حجابات" بن نہ جائیں
وہی ہوا، اس صنم کدے میں نہ ہو سکا انتخاب تیرا

حریف آگاہِ عشق کب تھے یہ راز تو نے انہیں بتایا
نہ جانے کیوں میری وحشتوں سے اُلجھ پڑا اضطراب تیرا

مری محبّت کی التجا پر کچھ اس تکلف سے تو نے دیکھا
تری نظر کی لطافتوں سے لطیف تر تھا جواب تیرا

مِٹا کے رہتا شکن جبیں کی حجاب اگر درمیاں نہ ہوتا
وہ نغمۂ شوق چھیڑتا میں کہ جھوم جاتا عتاب تیرا

جہاں کی مرجھا رہی ہیں نبضیں میں اسکو سمجھا نہ دوں اب اختر
بکھر کے رہ جائیں گے یہ اجزا اگر یہی ہے حجاب تیرا

---

[1] میں "نقاب" کو اس وزن کے اور الفاظ "جواب، حجاب" وغیرہ کی طرح بصیغہ تذکیر زیادہ صحیح اور موزوں سمجھتا ہوں۔ غالب نے کہا ہے: "زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا"۔

(۶)

وہ خود بھی اس شوق پر تھے حیراں کیا ہے جب انتخاب میرا
ابھی زمانے کو یاد ہوگا سوال اُن کا جواب میرا
خرد ہے آئینِ خام کاری، نہ آگہی ہے نہ ہوشیاری
یہ عالمِ ہوش بھی ہے شاید کوئی پریشاں سا خواب میرا
کہاں مری ہستیٔ گرامی کہاں یہ احساسِ ناتمامی
مگر ابھی خواب گاہِ فطرت میں سو رہا ہے شباب میرا
لٹا کے سرمایۂ جوانی اسے عطا کی ہے زندگانی
عروسِ ہستی کے خال و خد میں جھلک رہا ہے شباب میرا
مجھے سمجھتا ہے کیا زمانہ حجاب اندر حجاب ہوں میں
ہوا جو صبحِ ازل کی رونق، وہ جلوہ تھا بے حجاب میرا
یہ پرسشِ حال کوئی دیکھے کہ بات اِدھر کی اُدھر چلے وہ
ابھی مرے ناشگفتہ ہونٹوں پہ کانپتا تھا جواب میرا
وہ شوقِ بیتاب دے کے اختر مجھے یہ محسوس کر رہے ہیں
اُلٹ کے رکھ دے بساطِ ہستی نہ عالمِ اضطراب میرا

(۷)

دیا تھا ہوش تو یہ بھی مرا خدا کرتا
جنونِ عشق کو ہستی کا رہنما کرتا

دل و نظر کی سخن گستری کو کیا کرتا
نہیں تو میں ستمِ دوست کا گلا کرتا

نہ پوچھنے پہ تو یہ حال ہے کہ مرتا ہوں
وہ پوچھتے تو نہ جانے میں اور کیا کرتا

تباہِ شوق ہوں اے کاش کوئی جلوۂ شوخ!
مری حیات کو آسودۂ فنا کرتا

حقیقتِ غمِ دل تجھ سے کیا کہوں اے دوست!
خدا یہ دولتِ سرمد تجھے عطا کرتا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور اعترافِ ستم
تجھے اگر نہ سمجھتا تو میں گلا کرتا

غمِ حیات کو اخترؔ سمجھ لیا جس نے
دعائے مرگ نہ کرتا تو اور کیا کرتا

(۸)

پردۂ غم اُٹھا دیا، چاکِ جگر نے کیا کیا
دردِ نہاں سنا دیا، دیدۂ تر نے کیا کیا

مجھ کو یہ اضطراب ہے کیوں مرے دل نے آہ کی
ان کو یہ انفعال ہے اُن کی نظر نے کیا کیا

درد کو جاوداں کیا، حُسن کو دی ستم کی خو
لذّتِ غم سے کیا مِلا ذوقِ نظر نے کیا کیا

عادتِ ضبط ترک کی قلبِ حزیں کو کیا ہوا
غم کو فسانہ کر دیا، دیدۂ تر نے کیا کیا

مجھ کو شبِ فراق بھی کچھ تو امیدِ جانبری
دل ہی مگر بجھا دیا شمعِ سحر نے کیا کیا

اخترِؔ نامراد، وہ اور بھی شوخ ہو گئے
عرضِ نیازِ عشق کے درد و اثر نے کیا کیا

(۹)

بے پردہ جو وہ جلوۂ پنہاں نظر آیا
اٹھتا ہوا اک حُسن کا طوفاں نظر آیا

جو قطرۂ مئے جام میں رقصاں نظر آیا
آئینۂ اسرارِ گلستاں نظر آیا

پھر دل میں جنوں، سلسلہ جنباں نظر آیا
شیرازۂ کونین پریشاں نظر آیا

وحشت میں کھُلا نارسیٔ عقل کا عالم
ہر تار گریباں کا رگِ جاں نظر آیا

کیا جانئے مئے تھی کہ ضیائے رخِ ساقی
اک نور سا پیمانے میں غلطاں نظر آیا

اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم
صحرا میں بھی اندازِ گلستاں نظر آیا

پھر حُسن نے کی تازہ رہ و رسمِ تماشا
پھر چاکِ گریباں بہ گریباں نظر آیا

مئے پی تھی کہ ہونے لگی انوار کی بارش
یہ کفر تو سر دفترِ ایماں نظر آیا

ہر سانس میں تھی صبر شکن جس کی تمنا
ہر سانس کے پردے میں خراماں نظر آیا

اللہ رے عرفانِ غمِ عشق کہ اختؔر
ہر ذرّہ مجھے دشت بہ داماں نظر آیا

(۱۰)

ساقی جو یہی جلوۂ مستانہ رہے گا
پیمانہ نہ منت کشِ پیمانہ رہیگا

معمورِ تمنّا دلِ دیوانہ رہے گا
زندہ ہیں تو آباد یہ ویرانہ رہیگا

منت کشِ نظارہ ہی جبتک نگہِ شوق
نظارہ نقابِ رُخِ جانانہ رہیگا

اِک منظرِ اوہامِ حقیقت ہے زمانہ
افسانہ ہے افسانہ اور افسانہ رہیگا

ہے گرم یہ ہنگامہ حجاباتِ نظر تک
پھر شمع، نہ رقصِ پرِ پروانہ رہیگا

وہ وقت بھی آئیگا ضرور اے نگہِ شوق
جب حُسن بہ اندازِ حریفانہ رہیگا

کھویا ہی مرے دل کو غمِ عشق نے اختؔر
دیوانہ ہے کمبخت یہ دیوانہ رہیگا

(۱۱)

دل بجھا سوزِ محبّت نہ گیا
وہ تصوّر کسی صورت نہ گیا

دل کی ویرانی کو مدت گذری
اک مگر عالمِ عبرت نہ گیا

کروٹیں وقت نے بدلیں کیا کیا
اثرِ گردشِ قسمت نہ گیا

تھا تو دنیا کا فسانہ دلچسپ
تا بہ رودادِ حقیقت نہ گیا

جا چکے تاب و تواں صبر و سکوں
ایک غم دل کی بدولت نہ گیا

رہ گئے کانپ کے کھُلتے ہوئے لب
نالہ تا حدِّ شکایت نہ گیا

بُجھ گئیں گرچہ امنگیں اختؔر
دل سے احساسِ محبت نہ گیا

(۱۲)

محبّت سے دل آشنا ہو گیا زمانہ ہی اب دوسرا ہو گیا
رسا نالۂ نارسا ہو گیا بڑھا درد یوں، خود دوا ہو گیا
ہٹالی نظر میں نے کونین سے عطا جب دلِ مبتلا ہو گیا
پڑی تھی اچٹتی سی اُن کی نظر نہ جانے مرے دل کو کیا ہو گیا
خوشا اے ہجومِ غمِ جاں گداز مجھے موت کا آسرا ہو گیا
رہا میں محبّت میں گو نامراد مگر دل تو درد آشنا ہو گیا

پریشاں نظر، رنگ فق، منہ اُداس
یہ اخترؔ کہیں مبتلا ہو گیا

(۱۳)

خراباتیوں کی روش پر نہ جانا کہ ہے اُن کی مٹھّی میں سارا زمانا
نگاہوں میں شوخی، حیا کا بہانا قیامت ہے یہ زیرِ لب مسکرانا
محبّت کی دنیا میں اے اہلِ دانش یہ ہستی ہے بھولا ہوا اک فسانا
اُدھر اک تجلّی اِدھر اک تحیّر وہ اُن کی حقیقت، یہ میرا فسانا
وہ دن یاد ہیں جب تمہاری جبیں پر جوانی کو آیا نہ تھا مسکرانا
میں اس خاک پر نقش مبہم ہوں لیکن تمہاری حقیقت ہے میرا فسانا

سکوں مجھ کو اخترؔ نہ آیا میسّر
بدلتا رہا گرچہ پہلو زمانا

(۱۴)

چمن اب عہدِ گل میں بھی جنوں ساماں نہیں ہوتا
گریباں سامنے ہوتا ہے، جب داماں نہیں ہوتا

بقدرِ امتیازِ حیرت و عرفاں نہیں ہوتا
کوئی جلوہ حریفِ جلوۂ جاناں نہیں ہوتا

گئے وہ دن جب ان کانٹوں میں پھولوں کی لطافت تھی
کہ اب دل کا لہو بھی زینتِ مژگاں نہیں ہوتا

مری صحت کے طالب، رحمتیں اللہ کی تجھ پر
مگر دردِ نہاں منت کشِ درماں نہیں ہوتا

رہا کرتے ہیں گرمِ رقص جلوے یادِ جاناں کے
اُجڑ جاتا ہے لیکن قصرِ دل ویراں نہیں ہوتا

محبت نام ہے احساسِ غم کی اک لطافت کا
کہ غم ہوتا ہے احساسِ غمِ پنہاں نہیں ہوتا

محبت میں کہیں چھپتی ہیں دل کی جنبشیں اختر
یہ ہے وہ رازِ رسوا جو کبھی پنہاں نہیں ہوتا

(۱۵)

جو ہدف ہو تیری نگاہ کا، گلۂ ستم وہ کرے گا کیا[۱]
جسے تو سکوت کا درس دے وہ زباں سے اپنی کہے گا کیا

مجھے اے نسیم بہار تو نہ سنا ترانۂ سرخوشی
کہ گراں ہے جس پہ ہر اک نفس وہ یہ جام عیش پیے گا کیا

جو سکونِ دل سے ہو بےخبر اسے بزمِ عیش سے کیا غرض
جسے آہ و اشک ہو زندگی، وہ رہینِ درد ہنسے گا کیا

کوئی تجھ سے بلبلِ خوش نوا مجھے دشمنی تو نہیں مگر
جو خزاں کی زد میں ہو مضمحل، وہ چمن کھلا تو کھلے گا کیا

جسے عشق لذتِ غم نہ دے اسے کیوں حیات گراں نہ ہو
جو پیامِ دل بھی نہ سن سکے، وہ نوائے روح سنے گا کیا

رگ و پے میں صبر شکن خلش جسے دو گھڑی بھی سکوں نہ دے
وہ مریض اخترِ بے نوا، کوئی دن جیا تو جیے گا کیا

[۱] "میں ایطاء کا پابند نہیں ہوں"

(۱۶)

موجِ نوائے عیش کیا نالۂ بے قرار کیا
عشق کے چند خواب ہیں کیسی خزاں بہار کیا

عشق، حریفِ جاں سہی، فکرِ مآلِ کار کیا
دانشِ خود فریب کون؟ ہوش کا اعتبار کیا!

میرے لئے ہے کائنات، اف رے فریبِ گفتگو
کیجئے ظلم کیجئے، جبر یہ اختیار کیا

ہجرِ تباہ کار کا میری بلا کرے خیال
رونقِ بزمِ دل نہیں جلوۂ یادِ یار کیا

تیری ادا شناس درد، مست ہیں اپنے حال میں
عہدِ نشاطِ وصل کیا عالمِ انتظار کیا

پھیلے ہوئے ہیں ہر طرف دامِ فریبِ پیچ کی چال
معنیٔ اعتبار بن صورتِ اعتبار کیا

اخترِ زار جب، حیات خود ہی تصوّرِ غلط
عشرتِ روزگار کیوں، عبرتِ روزگار کیا

(۱۷)

خود فقیہِ شہر بھی رندوں میں شامل ہو گیا
یعنی اب آئینِ عقل و ہوش باطل ہو گیا

وہمِ ہستی، پردۂ اسرارِ منزل ہو گیا
بیخودی کیا ہوش کا عرفاں بھی مشکل ہو گیا

بیخودی نے جب نمایاں کر دئے اسرارِ شوق
خود بخود برہم نظامِ دانش و دل ہو گیا

دم بدم ساحل سے ٹکرا کر پلٹ جاتی ہے موج
ایک میں ناداں اسیرِ دامِ ساحل ہو گیا

اہلِ دانش خاک کے اس کھیل میں الجھے رہے
اہلِ بینش کیلئے ہر سانس مشکل ہو گیا

جھک گئی خود میری قدموں پر جبینِ روزگار
جب دلِ بیتاب غم سہنے کے قابل ہو گیا

اُن کے جلوے دل میں رہ کر آشنائے دل نہیں
مجھ سے اُن کا قرب ربطِ موج و ساحل ہو گیا

اُن سے رسم و راہ بھی اختر قیامت ہو گئی
ہر ادا سفاک، ہر انداز قاتل ہو گیا

(۱۸)

لِلّٰہ او ستمگر! اب یہ ستم نہ کرنا
خوکردۂ جفا ہوں مجھ پر کرم نہ کرنا

احساس عاشقی ہی حد درجہ نرم و نازک
دل کے لہو سی غافل پلکوں کو نم نہ کرنا

غم مجھ کو دینے والے فطرت مری بدل دے
یعنی مجھے سکھا دے احساسِ غم نہ کرنا

لے دے کے رہ گیا ہی جینے کا یہ سہارا
جو درد دے چکے ہو اب اسکو کم نہ کرنا

مقصود ہی جو اختر تعمیر زندگی کی
اجزائے عقل و دل کو ہرگز بہم نہ کرنا

(۱۹)

بقدرِ ظرفِ جنوں حُسنِ آب و گل پایا
کسی کو درد ملا اور کسی نے دل پایا

یہ خد و خالِ طرب ہیں مصوری کا فریب
وہ نقشِ غم ہے یہاں جسکو مستقل پایا

نگاہِ ناز ہے پھر بر سرِ کرم شاید
کہ ایک تیر سا نشتر قریبِ دل پایا

پیامِ مرگ ہی یارب کہ یہ نویدِ وصال
کچھ آج دل میں غمِ دل کو مضمحل پایا

ہجومِ کشمکشِ روزگار میں اختر
جنونِ عشق کو رازِ سکونِ دل پایا

(۲۰)

نہیں کچھ منحصر اس پر کہ غم سہنا نہیں آتا
مجھے اے تلخیٔ ایّام! خوش رہنا نہیں آتا

انہیں الزام کیا دوں انکے اندازِ تغافل کا
کہ خود میری زباں کو حالِ دل کہنا نہیں آتا

مری مظلوم چپ پر شادمانی کا گماں کیوں ہو
کہ ناامیدیوں کے زخم کو بہنا نہیں آتا

نگاہِ مضطرب عرضِ تمنّا کر ہی دیتی ہے
زباں کی طرح اخترؔ اسکو چپ رہنا نہیں آتا

(۲۱)

رات پھر مطرب حریفِ عرصۂ اوہام تھا
ساز کے تاروں میں جو نغمہ تھا اک الہام تھا

عہدِ ہجراں بے نیازِ گردشِ ایّام تھا
صبح تھی لیکن وہی رُخ پر نقابِ شام تھا

میری ہر آنسو میں غلطاں ہے جمالِ روئے دوست
اور یہ دنیا سمجھتی ہے کہ میں ناکام تھا

اک خلش صبر آزما پھر اک سکونِ بے خلش
عشق کا آغاز تھا وہ، اور یہ انجام تھا

سادہ دل غنچے سمجھتے کاش آئینِ بہار
یعنی یہ بھی اک فریبِ گردشِ ایّام تھا

فطرتِ آزاد کو ناچار پینا ہی پڑا
زندگی کا جام آخر زندگی کا جام تھا

برق نے گرتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا ہمصفیر
یہ اسی کا آشیاں ہے کل جو زیرِ دام تھا

حیف اے دنیا کہ اخترؔ اور ایسا تشنہ کام
یہ کبھی سر حلقۂ رندانِ مئے آشام تھا

(۲۲)

ٹوٹ سکا نہ آج تک سحرِ امید و یاس کا
جلوۂ ہوش نام ہے ظلمتِ بے قیاس کا

اب مرے آنسوؤں میں ہے دل کے لہو کی آب و تاب
آپ نے اجر دے دیا مجھ کو مرے سپاس کا

ان کی نگاہِ التفات وجہِ سکوں تو کیا ہوئی
اور بگڑ گیا نظام انجمنِ حواس کا

عہدِ کرم کا واسطہ اس کو نہ یوں تباہ کر
دل ہی تو اک مقام ہے تیری کرم کی آس کا

سیرِ جمال کے عوض کاش یہ خود شناس ہو
شوق ہے ناتمام ابھی چشمِ خدا شناس کا

میرے حواس لے لئے ان کی مئے جمال نے
دل میں اب اک ہجوم ہے حیرتِ بے قیاس کا

شکوہ تو اک طرف کہ اب جنبشِ لب بھی ہے گناہ
ذوقِ سپاس دیکھنا اخترِ ناسپاس کا

(۲۳)

خلشِ جاں فزا نے لوٹ لیا
اُن کے حُسنِ جفا نے لوٹ لیا

نیچی نظریں لبوں پہ مہرِ سکوت
اس حجاب و حیا نے لوٹ لیا

حُسنِ بیداد کی دہائی ہے
دردِ صبر آزما نے لوٹ لیا

آہ بھی لب تک آ نہیں سکتی
مجھ کو شرمِ وفا نے لوٹ لیا

ہر نفس ہے تلاشِ زخمِ جگر
رنجِ راحت فزا نے لوٹ لیا

کون ہوں کیا ہوں کیا بتاؤں میں
اِس بقا، اس فنا نے لوٹ لیا

بھیس میں دل کے، راہزن بن کر
مجھ کو اِک رہنما نے لوٹ لیا

میرا سرمایۂ حیات اختر
میرے ذوقِ فنا نے لوٹ لیا

(۲۴)

اب ذوقِ وفا ترک کیا بھی نہیں جاتا
بے حسرتِ بیداد رہا بھی نہیں جاتا

بیگانۂ احساس بھی ہے سینۂ ہستی
جیتے ہیں کہ مایوس ہوا بھی نہیں جاتا

سر حلقۂ اسرار و معارف ہوں مگر آہ
اس طرح گرا ہوں کہ اٹھا بھی نہیں جاتا

وہ پرسشِ حالات پہ مائل نہیں ہوتے
افسانۂ دل مجھ سے کہا بھی نہیں جاتا

بے پردہ و بے جلوہ نہاں بھی ہوں عیاں بھی
چھپنے کی طرح تم سے چھپا بھی نہیں جاتا

اللہ رے مزاجِ نگہِ دوست کا عالم
شوخی بھی ہے اندازِ حیا بھی نہیں جاتا

کھویا خلشِ وہم و گماں نے مجھے اختر
زندہ بھی ہوں احساسِ فنا بھی نہیں جاتا

(۲۵)

مقدر کہاں سے کہاں ہوگیا
فنا ہو کے میں جاوداں ہوگیا

ترے غم کا جو راز داں ہوگیا
اسیرِ مکاں، لامکاں ہوگیا

کبھی قابلِ ذکر تھا حالِ دل
اب آزادِ شرح و بیاں ہوگیا

کسی طرح آہی گیا دل کو صبر
قفس اب مرا آشیاں ہوگیا

کوئی اور طرزِ ستم سوچیے
دل اب خوگرِ امتحاں ہوگیا

جنوں میں کہاں زندگانی کا ہوش
کہ وہ عہد خوابِ گراں ہوگیا

محبت کی اللہ رے بخششیں
جو محدود تھا بے کراں ہوگیا

سناتے تو ہو حالِ اختر اُسے
وہ کافر اگر بد گماں ہوگیا؟

(۲۶)

دل نے پھر انگڑائی سی لی پھر صبح کا منظر کھلا
مسکرائے پھول گویا حُسن کا دفتر کھلا
پھر بہار آئی نشاطِ روح کا منظر کھلا
ساز جاگے، جام چھلکے، میکدے کا در کھلا

آشیاں اجڑا، گلستاں لٹ گیا، جاتا کہاں
بارہا یوں تو بہار آئی قفس کا در کھُلا

عشق کے جلوے نظر آئے نقاب اندر نقاب
حُسن سو پردوں میں رہ کر بارہا مجھ پر کھلا

چار تنکے تھے نشیمن کے الٰہی خیر ہو
دل دھڑکتا ہے کہ پاتا ہوں قفس کا در کھلا

میکشو! منت کشِ موسم نہیں آئینِ کیف
کیا ہوا اگر فصلِ گل میں میکدے کا در کھلا

ان کو یہ حسرت کہ میں کہتا زباں سے حالِ دل
مجھ کو یہ حیرت کہ یہ رازِ نہاں کیونکر کھلا

کس قدر صبر آزما ہے اہلِ دنیا کا فریب
آستینِ اخترؔ جسے سمجھا تھا میں خنجر کھلا

(۲۷)

اجزائے غم نے جوہرِ قابل بنا لیا
اک بوند تھی لہو کی جسے دل بنا لیا

تو نے، کہ تو سمجھ نہ سکا رازِ جبر دوست
ہر وہم اختیار کو قاتل بنا لیا

سمجھا جنھوں نے کشمکشِ زندگی کا راز
گرداب ہی کو دامن ساحل بنا لیا

اے اہلِ شوق دل کی حقیقت ہے اس قدر
بیتابیوں کو جمع کیا دل بنا لیا

تسکینِ دل تھی چند نگاہوں پہ منحصر
ان کو بھی تم نے پردۂ حائل بنا لیا

دل نے تری نگاہ کے انداز دیکھ کر
اپنے کو عقل و ہوش سے غافل بنا لیا

اختر ہنوز روح نہیں فارغِ عدم
دنیا نے اک فسانۂ باطل بنا لیا

(۲۸)

سلامت مرا اضطرابِ محبّت
وہ کب تک نہ دینگے جوابِ محبّت

سکوں آفریں اضطرابِ محبّت
محبّت ہی خود ہے جوابِ محبّت

مری بیخودی ہے اُن آنکھوں کا صدقہ
چھلکتی ہے جن سے شرابِ محبت

اُلٹ جائیں سب عقل و عرفاں کی بحثیں
ابھی گر اُٹھا دوں نقابِ محبّت

بکھر جائے شیرازۂ وہمِ ہستی
اگر ٹوٹ جائے حجابِ محبّت

کھلا سوز و سازِ محبّت سے اختر
محبت ہے خود بھی خرابِ محبّت

(۲۹)

گردشِ رنگ و شوخیٔ مشتِ غبار دیکھ کر
آ ہی گئی لبوں پہ آہ، شانِ بہار دیکھ کر

ہوش اُڑے روانیٔ موجِ بہار دیکھ کر
آپ میں رہ سکے نہ ہم جلوۂ یار دیکھ کر

گردشِ جامِ رنگ و بو اور یہ بساطِ آب و گل
یہ بھی تو دیکھ! مستیٔ بادِ بہار دیکھ کر

زخمِ درون و سوزِ غم صلۂ ناتمامِ عشق
طالبِ دوست! ہمتِ صبر و قرار دیکھ کر

حیف وہ رندِ نامراد جس نے اٹھا کے جامِ مئے
ہاتھ سے پھر گرا دیا رنجِ خمار دیکھ کر

یوں بھی تو پائمال تھا کشتۂ نامرادِ عشق
مشقِ خرام کیجیئے خاکِ مزار دیکھ کر

اخترِ بیقرار تھا پہلے سے بے نیازِ ہوش
اور بھی کھو کے رہ گیا جلوۂ یار دیکھ کر

(۳۰)

دانشِ ناتمام کو یوں نہ شریکِ راز کر
عام ابھی نہ اے جنوں! دعوتِ سوز و ساز کر

مسلکِ اہلِ شوق کے ہیں یہی دو اُصولِ خاص
آپ حریفِ ضبط ہو آپ ہی ضبطِ راز کر

دیکھ بساط اُلٹ نہ جائے عالمِ عقل و ہوش کی
چاک نہ اے جنونِ شوق پردۂ امتیاز کر

لذّتِ شوق کیا ملی ہوش کی آنکھ کھل گئی
اب یہ دعا ہے اے خدا عمرِ جنوں دراز کر

عشق بقدرِ آرزو تشنۂ زخم ہے ابھی
تیرِ نگاہِ ناز کو اور بھی دلنواز کر

دل کی ہر اک شکست میں فتح کا راز ہے نہاں
نشترِ تیر کھائے جا زخمِ دروں پہ ناز کر

دیکھ لیا مآلِ کار غمکدۂ حیات میں
اخترِ نامراد، اور موت سے احتراز کر

(۳۱)

سینے میں دل ہے دل میں رُوح، تیر لگا، شکار کر
دل کی جراحتوں کو چھیڑ، روح کو بیقرار کر

تجھ سے حیات و موت کا مسئلہ حل اگر نہ ہو
زہرِ غمِ حیات پی، موت کا انتظار کر

ڈر ہے کہ بجھ کے رہ نہ جائے شمعِ حریمِ کائنات
پردہ اُلٹ نقاب اُٹھا، حُسن کو آشکار کر

تجھ کو ہے کس نشاط کی بزمِ حیات میں تلاش
چاک تو اے دلِ حزیں پردۂ اعتبار کر!

عقل ہے نارسا ابھی، اپنی جبیں کا داغ دیکھ
غم ہی کو جاوداں سمجھ، جبر ہی اختیار کر

جورِ خزاں کا شکوہ کیا، یہ تو مآلِ عیش ہے
دل کے لہو سے زینتِ جلوۂ نو بہار کر

رسمِ جنوں نہیں ہے یہ یوں نہ لٹا متاعِ اشک
کچھ تو خیالِ وضع بھی اخترِ بیقرار کر

(۳۲)

رہا پردہ کوئی باقی نہ رازِ کیف و مستی پر
یہ کس نے انگلیاں رکھ دیں الٰہی سازِ ہستی پر

تلاشِ حُسن ہے آوارگی میری نگاہوں کی
نہ کیجے اشتباہِ کفر میری بت پرستی پر

اُسی اندازِ مستانہ سے آ، کھولے ہوئے زلفیں
کہ اب بھی کچھ حجابِ راز ہیں آئینِ مستی پر

وہ دورِ جام اور پی پی کے وہ میرا بہک جانا
وہ ان کا مسکرا کر دیکھنا پھر، عذرِ مستی پر

فلک کی رفعتیں جھکتی ہیں میرے آستانہ پر
محبّت مسکراتی ہے مِرے احساسِ پستی پر

خوشا مستی! کہ پردے اُٹھ گئے میری نگاہوں سے
ہزاروں ہوش قرباں ایک میری مئے پرستی پہ

دمِ رخصت کسی کا مسکرانا یاد ہے اختؔر
ہنوز اک برق سی لہرا رہی ہے دل کی بستی پر

—— ۳۳ ——

افسانۂ جہاں کو حقیقت کئے بغیر
بنتی نہیں کسی سے محبت کئے بغیر

زاہد! حریم دل میں وہ ملتا ہے بے حجاب
طاعت کئے بغیر عبادت کئے بغیر

اب خود نہیں تو وجہ غم دل ہے انکی یاد
رہتے نہیں وہ کوئی شرارت کئے بغیر

سنتا رہا ہوں دوزخ و جنت کی داستاں
لیکن خیالِ دوزخ و جنت کئے بغیر

جھکتی ہے آستانۂ جاناں پہ خود جبیں
بنتی نہیں ہے سجدۂ طاعت کئے بغیر

اُلجھے رہے فسانۂ ہستی میں اہلِ دہر
ناداں، امتیازِ حقیقت کئے بغیر

اختؔر کسی سے دب نہ سکی فطرتِ بلند
پیتے ہیں اعترافِ ندامت کئے بغیر

—— (۳۴) ——

جو راز ابتک حجاب میں ہیں وہ خود بخود آئیں گے زباں پر
ادا تو کر سجدۂ عقیدت نگارِ فطرت کے آستاں پر

قفس میں ہوں ہمصفیر! آزادیوں کا صدقہ خبر تو لینا
کہ بجلیاں رقص کر رہی تھیں! ابھی ابھی میرے آشیاں پر

ترا یہ دعویٰ، رموزِ فطرت سے آشنا ہیں تری نگاہیں!!
پڑے ہوں تاریکیوں کے پردے جب اس قدر عرصۂ جہاں پر

زمیں کی جانب بھی دیکھ ناداں کہ ذرہ ذرہ ہے مہرِ تاباں
رہے گی تیری نگاہ کب تک جمی ہوئی اوجِ آسماں پر
مجھے نہ دے طعنِ سطح بینی نہ کھا فریبِ حیات ہمدم
جہاں کے ہر شعبۂ عمل میں یقیں کی بنیاد ہے گماں پر
زمانہ سر دُھن رہا ہے جس پر نمود ہے سطح کی وہ اخترؔ
نہ جانے کیا ہو جو روحِ شاعر کے بھید آجائیں سب زباں پر

(۳۵)

یوں مری حالتِ موجودہ کا اندازہ نہ کر
ہمنشیں قصّۂ دیرینہ کو اب تازہ نہ کر
عقل ہے رازِ جنوں اور جنوں سرِّ حیات
قلزم آشام بن اندیشۂ خمیازہ نہ کر
ذرّہ ذرہ ہے تری فیض سے بیخود ساقی
بند مجھ پر ہی ان اکرام کا دروازہ نہ کر
اُٹھ کہ ہے بادِ سحر گاہ طرب خیز اخترؔ
رات کے گریۂ محروم کو اب تازہ کر

(۳۶)

درد کے اسرار کہئے گوشِ محرم دیکھ کر
چھیڑتے ہیں ساز ہر صحبت کا عالم دیکھکر

ہر نشاطِ زندگی کی انتہا غم دیکھ کر
جی بھر آیا صبح کے پھولوں کا عالم دیکھکر

وہ کھنچے جتنے، مقامِ شوق طے ہوتے گئے
ولولے چمکے مزاجِ حسن برہم دیکھکر

طائرِ مجبور کو آخر سکوں آہی گیا
دامنِ گل پر نشانِ اشکِ شبنم دیکھکر

کون کر سکتا ہے اختر زندگی کا اعتبار
اسقدر بے ربطیٔ اجزائے عالم دیکھکر

(۳۷)

وجہ فنائے ذات ہوئی انتہائے عشق
اب دل میں اک لطافتِ غم ہی بجائے عشق

کیوں اہلِ بزم اب وہ کہاں ہی غرورِ ہوش
دیکھا! حدیثِ حسن ہے خود ماجرائے عشق

اک عشوہ حقیقتِ پنہاں ہی گرمِ کار
کچھ ابتدائے عشق نہ کچھ انتہائے عشق

ٹوٹا نہیں ہنوز حجابِ فریبِ ہوش
اک نغمہ اور! مطربِ رنگیں نوائے عشق

کونین اسکے گوشۂ دامن میں گرمِ رقص
وہ ذرۂ بسیط کہ ہے آشنائے عشق

گل سینہ چاک ہوئے سبک سیر بیقرار
اللہ رے روانیٔ موجِ ہوائے عشق

اختر بقدرِ شوق نہیں سوز و سازِ دل
کچھ اور چاہیے غمِ صبر آزمائے عشق

(۳۸)

ای کاش اہلِ عقل کو ہو امتیازِ عشق — یعنی حیات کیا ہی، مگر سوز و سازِ عشق
بجلی سی ہی کوئی مری رگ رگ میں گرمِ رقص — اللہ رے لطافتِ سوز و گدازِ عشق
سمجھا ہی اک حقیقتِ باطن جسے مجاز — ہی خود وہی حقیقتِ باطن مجازِ عشق
زاہد تری سمجھ میں نہ آئیگا یہ مقام — نا آشنائے کفر و یقیں ہے نمازِ عشق
چھیڑا نہیں ہی نغمۂ صبحِ ازل ہنوز — چھیڑا ہی آپ مطربِ فطرت نے سازِ عشق
اب خطرۂ فنا ہی نہ اندیشۂ حیات — اللہ رے اہتمامِ غمِ دل نوازِ عشق
اختر حجابِ جلوۂ دانش ہی وہمِ ہوش
عرفانِ رازِ عقل ہی عرفانِ رازِ عشق

(۳۹)

یہ اہلِ درد یہ ہنگامۂ جفا کب تک — بنے رہینگے الٰہی! یہ بُت خدا کبتک
کسے خبر ہی رہینگے یہ ساکنانِ حرم — فریب خوردۂ پیرانِ پارسا کبتک
چلا ہی اور نہ چلیگا فریبِ نکہت و رنگ — یہ موجِ گل یہ سبک سیریٔ صبا کبتک
نشاطِ دہر کی اک سانس بھی ہی عمرِ دراز — کہ یہ نگاہ، یہ دل، اور یہ مدعا کبتک
اسیرِ دامِ ہوس رہ چکا بہت اختر
تری نگاہ نہ ہوگی خود آشنا کبتک

(۴۰)

یہ عقل و عرفاں کی گفتگو کیا، یہ بحثِ نقص و کمال کب تک
اٹھا بھی دو اب حجاب، یعنی یہ اہتمامِ جمال کب تک

فنا سے لے درسِ کامیابی، ارادۂ منزلِ یقیں کر
طلسمِ ہستی میں آشنائے مناظرِ احتمال کب تک

نہ کر نتائج کی جستجو میں تباہ بزمِ نشاط اپنی
جہاں، کہ آغاز ہے سراپا یہاں تلاشِ مآل کب تک

یہ زندگی ہے کہ موت ناداں! یہ سرخوشی ہے کہ تشنہ کامی،
رہے گی مصروفِ خواب آخر تری نشاطِ خیال کب تک

نقاب اُٹھا حُسنِ منتظر سے کہ تیرگی بڑھتی جا رہی ہے
تجھے مہہ جلوہ زارِ بینش! یہ اعترافِ زوال کب تک

بلند ہے کارِ شوق اختر ملال و عشرت کی ان حدوں سے
یہ ہے محبت کی ناتمامی، فریبِ ہجر و وصال کب تک

یہ بھی نظر کا دھوکا ہے یا کارِ نظر ہے کیا معلوم
خاک کے ذرّے رقصاں ہیں یا موجِ گہر ہو کیا معلوم

کون نہ جانے محوِ ستم ہے ناحق شکوے کیوں کیجیے
دہر ہو یا اس پردے میں وہ عربدہ گر ہے کیا معلوم

عارف و عاقل دونوں کچھ کھوئے سے نظر آتے ہیں مجھے
ہستی کے اسرارِ نہاں کی کس کو خبر ہے کیا معلوم

راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہمدم! اک مدّت سے روتا ہوں
میری آہِ نیم شبی میں کوئی اثر ہے کیا معلوم

ہستی کا ہنگامہ بپا ہے سانس کے آنے جانے پر
عالمِ ضبط و تمکیں ہے یا رقصِ شرر ہے کیا معلوم

دیوانے تو دیوانے ہیں اُن کو اپنا ہوش کہاں
عقل پہ جن کو ناز ہے اِتنا اُن کو مگر ہے کیا معلوم

ہجر کی شب، طوفانِ ہجومِ اشک میں اتنا ہوش کہاں
سینے میں ہو قلب، کہ صرفِ دیدۂ تر ہو کیا معلوم

ہم نے تو رو کر ہی گذاریں گھڑیاں عمرِ فانی کی
ہوگا، پاسِ دردِ محبت اُن کو اگر ہے کیا معلوم

(۴۲)

لیتے ہیں مستعار غم، عشرتِ جاوداں سے ہم
درد سے ہو جو بے نیاز، لائیں وہ دل کہاں سے ہم

حُسن کی بزمِ ناز میں چھیڑ رہے ہیں ذکرِ دل
کرنے چلے ہیں باخبر برق کو آشیاں سے ہم

آئے تھے اک ہجومِ شوق دل میں نہاں کیے ہوئے
جاتے ہیں سوزِ غم لیے آپ کے آستاں سے ہم

آج یہ کیا ہوا کہ ہیں صیدِ زبونِ بیکسی
کل ہی تو بہرہ مند تھے نعمتِ دو جہاں سے ہم

اب وہ مآل کچھ سہی شمع جلی تو ایک رات
آہ کہ بجھ کے رہ گئے پہلے ہی امتحاں سے ہم

عہدِ طرب کے ساتھ تھی عشرتِ سازوسر خوشی
پاتے ہیں اب سکونِ دل سوزِ غم وفغاں سے ہم

اختر اک آہِ زیرِ لب اس کو فسانہ کر گئی
کہہ نہ سکے جو رازِ غم اپنے ہی رازداں سے ہم

(۴۳)

تجھ کو تلاشِ حُسن ہے حُسن مگر کہاں نہیں — تابِ نگاہ چاہئے ذوقِ نظر کہاں نہیں
خوابِ گراں اگر نہ ہو ذرہ خود آفتاب ہے — سینۂ شب میں لرزشِ موجِ سحر کہاں نہیں
گرچہ حدیثِ درد ہے منتِ لب سے بے نیاز — شمعِ حریمِ بیکسی داغِ جگر کہاں نہیں
فکرِ عمیق چاہیے ذوقِ لطیف چاہیے — جنتِ گوش نغمۂ سازِ خبر کہاں نہیں
میرے جنونِ خام کا بے اثری مآل ہے — نالۂ بے قرار میں ورنہ اثر کہاں نہیں
میری ہی آنسوؤں میں کیا فیضِ جنوں ہے آشکار — دل کے لہو سے رونقِ دیدۂ تر کہاں نہیں

ہے یہ تجھی پہ منحصر اخترِ نامراد کیا
بزمِ جہاں میں اہلِ درد خاک بسر کہاں نہیں

(۴۴)

نغمۂ درد چھیڑ کر انجمنِ حیات میں — عشق نے جان ڈال دی پیکرِ کائنات میں
طور بھی اک نقاب ہے نور بھی اک حجاب ہے — محرمِ رازِ دوست ہے دامِ تصورات میں
تیری کرم کا کیا شمار ساقئ بادۂ الست — مستئ حُسنِ ذات ہے پرتوِ حسنِ ذات میں
بے خبرِ جمال کو جلوۂ بے حجاب کیا — لہر اک اور بڑھ گئی سیلِ تحیرات میں
کس سے کہوں لطافتیں حُسنِ فنائے ذات کی — اُلجھی ہوئی ہے کائنات پیچ و خمِ صفات میں
دعوتِ رقصِ جلوہ عام اور یہ نگاہ نا تمام — خود وہ حریفِ شوق ہے پردۂ التفات میں

اخترِ نامراد میں طالبِ مرگ ہی رہا
مجھ کو سکوں نہ مل سکا غمکدۂ حیات میں

(۴۵)

زہے کرشمہ! تصوّر میں آئے جاتے ہیں
جبینِ شوق میں سجدے بسائے جاتے ہیں

ابھی سے دیکھ رہا ہوں مآلِ سعیٔ تلاش
کہ ابتدا میں قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

جوابِ کیا ہو اب ایسے فریبِ رنگیں کا
نہاں ہیں اور نگاہوں پہ چھائے جاتے ہیں

حیاتِ عقل ابھی ناتمام ہے، یعنی
ہنوز رازِ محبت چھپائے جاتے ہیں

تڑپ رہا ہے ہر اک ذرہ خاکِ ہستی کا
وہ دیکھتے ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں

پھر ایک مست نظر ساقیا خدا کیلئے
کہ آپ میں تری مدہوش آئے جاتے ہیں

مآلِ بزمِ طرب دیکھنے کے قابل ہے
کہیں کہیں پرِ پروانہ پائے جاتے ہیں

تلاشِ دوست کی دشوار منزلیں اور ہیں
وہ ناتواں کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

تری ادا کے کرشمے تری نظر کے فریب
نظامِ دہر کو رنگیں بنائے جاتے ہیں

کہاں کے صورت و معنی کہاں کے غیب و شہود
کہ ہر لباس میں وہ خود ہی پائے جاتے ہیں

اُٹھو کہ دعوتِ نظارہ عام ہے اخترؔ
حریمِ ناز کے پردے اُٹھائے جاتے ہیں

(۴۶)

نہ دیارِ غیر میں چین ہے نہ وطن کے دشت و دیار میں
کہ ہزاروں ذرّے ہیں مضطرب مری ایک مشتِ غبار میں
یہ صفات و ذات کی بحث کیوں یہ حضور و غیب کی شرح کیا
جو نہ جا سکے درِ یار تک وہ الجھ گئے غمِ یار میں
مجھے انتظارِ اجل اِدھر کہ میں ہوں اسیر و شکستہ پر
اُدھر ایک نغمۂ جاوداں نفسِ نسیمِ بہار میں
وہی بیکسی و فسردگی وہی نیرگی و فتادگی
یہ مرا وجود ہے یا عدم یہ میں گھر میں ہوں کہ مزار میں
یہ غمِ زمانہ کے رنگ کو ہے کچھ اور شوخ کیا گیا
یہ سرود سازِ طرب نہیں کہ چھڑا ہوا ہے بہار میں
مجھے آہ اختر بے نوا، کہیں عمر بھر نہ سکوں ملا
جو سکوں ملا بھی تو وہ ملا کہ ہے رقصِ برق و شرار میں

(۴۷)

موسمِ گُل سو بار نہ آئے مانعِ دَورِ جام نہیں
دنیا کے اس کھیل میں الجھیں، رندوں کا یہ کام نہیں
حُسن فریبِ دیدہ و دل ہے دیدہ و دل ہیں حسنِ فریب
دیوانے یہ عالمِ رنگیں صبح نہیں یا شام نہیں
فطرت کا اک کھیل ہے یہ بھی خوابِ عدم کیا ہستی کیا
ہستی کا آغاز فنا ہے اور کوئی انجام نہیں
ان کے جلوے عام ہیں لیکن آنکھیں ہیں سرگرمِ تلاش
اب یہ خطا ہے آنکھوں کی یا ان کے جلوے عام نہیں
زحمتِ پرسش کی ہے کسی نے گرچہ ہے میرا حال خراب
آہ مگر کس مُنہ سے کہوں اب میں کہ مجھے آرام نہیں
تو ہے امید و بیم میں حیراں کھیل یہاں ہے بیم و امید
تیری طرح اے دانشِ ناداں عشق جنونِ خام نہیں
عشق کے منہ آتی ہے یہ ناداں اختر کچھ اس تیور سے
عقل کے جتنے راز ہیں گویا سلسلۂ اوہام نہیں

(۴۸)

دل ہے اور درد سے آباد نہیں
اُف تری یاد کہ کچھ یاد نہیں

عشق میں رخصتِ فریاد نہیں
درسِ تسلیم ہے، بیداد نہیں

آہی جاتا ہے نشیمن کا خیال
میں اسیری میں بھی آزاد نہیں

کب ہوئی آپ کو توفیقِ کرم
آہ! اب طاقتِ فریاد نہیں

شرحِ ایّامِ جوانی کو نہ پوچھ
خواب دیکھا تھا جو اب یاد نہیں

مطلبِ عشق ہے، حیرانیٔ دل
سعیٔ برباد، جو برباد نہیں

ہر ادا کہتی ہے اختؔر اُن کی
کوئی مجھ سا ستم ایجاد نہیں

(۴۹)

وہمِ ہستی مٹائے جاتے ہیں
دیدہ و دل پہ چھائے جاتے ہیں

اُن کے جلوے لطیف ہیں کتنے
دل و جاں میں سمائے جاتے ہیں

اب کہاں وہ لطافتِ غمِ دل
آپ کیوں یاد آئے جاتے ہیں

ہم تری رہگذر میں مٹ مٹ کر
ایک دنیا بسائے جاتے ہیں

ایک دل کی بساط کیا، لیکن
وہ ابھی آزمائے جاتے ہیں

دل کے اکثر فسانہائے جمیل
آنسوؤں میں سنائے جاتے ہیں

شیب میں بھی جواں ہے دل اختؔر
پھول ابھی مسکرائے جاتے ہیں

(۵۰)

حیات، موت ہے گر دل میں اضطراب نہیں
یہ جاگنے کی ہے دنیا مقامِ خواب نہیں

فضائے دل میں اگر بجلیوں کا رقص نہ ہو
تو یہ شباب کا اک وہم ہے شباب نہیں

مقام اور بھی ہیں دانش آزما لیکن
طلسمِ ہستیٔ فانی ترا جواب نہیں

تغیرات تو مقصد ہیں زندگانی کا
وہ زندگی ہے کوئی جسمیں انقلاب نہیں

اُٹھا سکے نہ رخِ ہوش سے نقابِ فریب
خرابِ بادہ، مگر اسقدر خراب نہیں

بہاریں بھی ہیں رنگینیاں قیامت کی
یہ سب درست، مگر آپ کا جواب نہیں

نہ غم بہ قدرِ تمنا نہ عیش تا حدِ شوق
وہ کامیاب ہے اختر جو کامیاب نہیں

(۵۱)

محبت کی تکمیل فرما رہے ہیں
نگاہوں کو دھوکے دئے جا رہے ہیں

مری جستجو کر اب اے وہمِ ہستی
کہ وہ مجھ سے مجھ کو لئے جا رہے ہیں

کہاں سے یہ آئی صدا بانسری کی
نگاہوں سے پردے ہٹے جا رہے ہیں

جوانی کا احساس ہے کیا قیامت
وہ اب اپنے سائے سے شرما رہے ہیں

یہ گلشن، یہ صحرا، یہ غنچے یہ سبزہ
جدھر دیکھتے ہیں تمھیں پا رہے ہیں

وہی رازِ مستی، وہی روحِ صہبا
وہی بیخودو مست فرما رہے ہیں

وہی پھر رہے ہیں نگاہوں میں اختر
وہی اب مری روح پر چھا رہے ہیں

(۵۲)

آپ رسوائے جہاں عشق کی روداد کروں
کوئی دیوانہ ہوں گیا میں بھی کہ فریاد کروں

کون ہے کس سے بیاں لذتِ بیداد کروں
تازہ اس عہد میں کیا شیوۂ فریاد کروں

دل کہاں اب کہ ترا حُسنِ ستم یاد کروں
لبِ خاموش کو آمادۂ فریاد کروں

وہ نگاہیں جو کبھی ڈوب گئی تھیں دل میں
اتنی فرصت ہو کہ بیٹھوں اور انہیں یاد کروں

نفسِ بادِ صبا نغمہ سرا ہو اور میں
قفسِ تنگ میں بیٹھا ہوا فریاد کروں!!

دل کی تسکیں کے لئے منتِ دوراں کبتک
لاؤ اس قصرِ تمنا ہی کو برباد کروں

عشق کہتا ہے کہ اب اک نئی دنیا اخترؔ
خود ہی تخلیق کروں خود ہی پھر آباد کروں

(۵۳)

شکر ہے ہر قید سے آزاد ہوں
بے وطن ہوں، خانماں برباد ہوں

یہ سکوں! پھر شکوہ کیسا ہمصفیر
میں رہینِ منّتِ صیاد ہوں

اس لئے ہوں شادماں ہنگامِ مرگ
بھولنے والے کو ابتک یاد ہوں

جو ازل سے ہے فضا میں گرمِ رقص
سینۂ ہستی کی وہ فریاد ہوں

زندگی تھی دل سے دل ہی بجھ گیا
اے اجل اب آ کہ میں آزاد ہوں

ہستیٔ برباد، عنواں ہے مِرا
میں مآلِ ہستیٔ برباد ہوں

شرحِ اسبابِ گرفتاری نہ پوچھ
میں کسی کا جلوۂ آزاد ہوں

غم سے رنگیں ہے جبینِ کائنات
شاد ہوں یارب کہ میں ناشاد ہوں

درد میں رہ رہ کے ہوتی ہے چمک
شکر ہے اخترؔ کہ ان کو یاد ہوں

(۵۴)

دل کی تسکین کہاں سے لاؤں　　افسانۂ غم کسے سناؤں
اک وقت ہے یہ بھی پیرِ گردوں　　میں اور ترے ستم اٹھاؤں!!
او دیدۂ و دل میں رہنے والے　　کس طرح سے میں تجھے بھلاؤں
رودادِ غمِ نہاں نہ سنئے　　کیا گذری ہے مجھ پہ کیا بتاؤں

نظروں میں وہ پھر رہے ہیں اختر
میں ہوش میں کس طرح سے آؤں

(۵۵)

دل سے راز و نیاز کی باتیں　　حسنِ حیرت نواز کی باتیں
عقلِ ظاہر پرست کیا جانے　　عشق کے سوز و ساز کی باتیں
اُف وہ تیرا تصورِ رنگیں　　اُف وہ راز و نیاز کی باتیں
اپنے جلووں کو بے حجاب نہ کر　　لب تک آتی ہیں راز کی باتیں

شرحِ آئینِ اہلِ باطن ہیں
اخترِ پاکباز کی باتیں

(۵۶)

غمِ جستجو تو بہت رہا مری آرزوئے نیاز میں
وہ حقیقتیں نہ کھلیں مگر جو نہاں ہیں پردۂ راز میں

وہ نشاطِ شوق کی بارشیں وہ غمِ نہاں کی لطافتیں
کوئی میرے قلب سے پوچھتا جو مزہ ہے سوز و گداز میں

وہ متاعِ عشرتِ سرمدی نہ یہاں ملی نہ وہاں ملی
نہ حیاتِ برق و شرار میں نہ بساطِ عمرِ دراز میں

وہی ایک حسن ہے جلوہ گر کوئی فرق ہے تو بس اسقدر
جو حقیقتوں میں چھپا رہا وہ کھلا لباسِ مجاز میں

چمنِ حیات میں آگیا یہ کہاں سے بادۂ کفر و دیں
نہ مرے حریمِ نیاز میں نہ کسی کی محفلِ ناز میں

میں امانتِ غمِ عشق ہوں مرے عجز کا ہے یہ مرتبہ
کہ ہزار عرش بسے ہوئے ہیں مری جبینِ نیاز میں

مجھے جستجوئے طرب نہیں یہ بتا کہ مطربِ خوش نوا
جو غمِ نہاں کو جگا سکے وہ نوا بھی ہے ترے ساز میں

(۵۷)

قیامت، غمِ دل کی عُریانیاں ہیں
اب اُن کی نگاہوں کو حیرانیاں ہیں

خطائیں نہیں اور پشیمانیاں ہیں
بڑے لطف کی میری نادانیاں ہیں

پھر اُس جانِ خوبی کی مہمانیاں ہیں
مئے ناب ہے اور غزل خوانیاں ہیں

محبّت کی راہوں میں، ہر ہر قدم پر
دل و دین و دانش کی قربانیاں ہیں

نہیں فطرتِ عشق آگاہِ پستی
پشیمانیوں سے پشیمانیاں ہیں

نہ محدود جلوے نہ محروم نظریں
مرے دل کو ناحق پریشانیاں ہیں

محبت کہاں ہے یہ اے اہلِ دنیا
جوانی کی مغرور نادانیاں ہیں

تعین سے ہٹ کر نگاہیں اٹھاؤ
جو دشواریاں ہیں وہ آسانیاں ہیں

بتا اے جنوں گمرہانِ خرد کو
یہ دانائیاں ہیں کہ نادانیاں ہیں

خوشا اُن کے جلووں کی حیرت نوازی
نگاہوں کو حاصل نگہبانیاں ہیں

وہ کب پرسشِ حال فرما رہے ہیں
جب اخترؔ نہیں کچھ پریشانیاں ہیں

(۵۸)

جنبشیں ہیں نقابِ جاناں میں — جان پڑ جائے گی گلستاں میں
وضع کی ہے جنوں نے نسبتِ خاص — تارِ دامن میں اور رگِ جاں میں
ظرفِ وحشت کی یہ بھی خامی ہے — ورنہ قیدیں کہاں ہیں زنداں میں
ساری برہم مزاجیاں اُن کی — ہیں عیاں گیسوئے پریشاں میں

توبہ کر وقتِ شیب تو اخترؔ
عمر گزری ہے جرم و عصیاں میں

۵۹

مسکراتی ہے محبت دل میں — ہے لطافت سی لطافت دل میں
دیکھ، نامحرمِ اسرارِ حیات — اِس فسانے کی حقیقت دل میں
تا دمِ مرگ کھٹکتا ہی رہا — خارِ محرومیٔ قسمت دل میں
آپ کے حُسنِ تغافل کی قسم — ہے فقط آپ کی حسرت دل میں
مسکراتا ہے تصوّر اُن کا — یا اُتر آئی ہے جنت دل میں
پھر کوئی چھیڑ رہا ہے رگِ دل — پھر نظر آتی ہے وحشت دل میں

بادہ ہے، وہ ہیں، اور اخترؔ میں ہوں
آج ہے رنج بھی راحت دل میں

(۶۰)

ہر اک سانس میں زہرِ غم پی رہا ہوں
نہ جانے کس امید پر جی رہا ہوں

بہار آ رہی ہے گلستاں میں شاید
کہ میں چاکِ دامن کو پھر سی رہا ہوں

تباہی مرے دل کی ہے اس کی شاہد
کہ میں تیری مرضی پہ راضی رہا ہوں

یہ خواب اب تو یوں ہی سا ہے یاد ہمدم
چمن میں کبھی آہ میں بھی رہا ہوں

دل افسردہ، لب خشک، ویراں نگاہیں
اگر ہے یہ جینا تو میں جی رہا ہوں

سکونِ اجل چاہتا ہوں کہ اخترؔ
بہت صرفِ بیدادِ ہستی رہا ہوں

(۶۱)

اللہ رے بے خودی کہ خبرِ دو جہاں نہیں
اب زندگی بقیدِ زمان و مکاں نہیں

اب دل کا حال قابلِ شرح و بیاں نہیں
کس کو خبر کہ درد کہاں ہے کہاں نہیں

جاری ہے دل میں دعوتِ مژگاں کا اہتمام
یعنی ہنوز سعیٔ جنوں رائیگاں نہیں

بہلا نہ ہمصفیر مجھے کیسے مان لوں
بجلی گری ہے جس پہ مرا آشیاں نہیں

دل جلوہ گاہِ حُسنِ یقین ہے بفیضِ عشق
اس انجمن میں دخلِ قیاس و گماں نہیں

کیا جانے کیا کیا نگہہ نازِ یار نے
قیدِ حیات اب مرے دل پر گراں نہیں

ہر ذرّہ ہے تجلّیٔ باطن سے آفتاب
اختؔر مشاہدہ ہے یہ وہم و گماں نہیں

(۶۲)

خراب و خوب کا وحشت میں امتیاز نہیں
تباہِ جادۂ غم ہوں یہ کوئی راز نہیں

خدا گواہ کہ ہے تنگِ عرصۂ ہستی
وہ دل کہ جس میں تمنائے سوز و ساز نہیں

کہاں کہاں ہے تری جستجو میں آوارہ
مری نظر کہ ابھی آشنائے راز نہیں

مری خطا ہے کہ میں ناشناسِ لذّتِ درد
سمجھ رہا تھا ترا درد دلنواز نہیں

بکھر رہے ہیں ابھی سے حیات کے اجزا
ابھی تو دوش پہ وہ کاکلِ دراز نہیں

حریم ناز ہے گر دل تو ہو مجھے اختر
طلب ہی اُن کی تلاشِ حریم ناز نہیں

(۶۳)

جنوں نے فاصلہ رکھا نہ کوئی عشق و عرفاں میں
گریباں کے عوض اب ہاتھ اُلجھتا ہے رگِ جاں میں

کہاں کا ہوش، کیسی آگہی، اِس بزمِ امکاں میں
مگر اک نیم بیداری سی ہے خوابِ پریشاں میں

یہ بجلی ہے کہ رقصِ جلوۂ گل خیز ہے ہمدم!
قفس میں ہوں مگر میرا نشیمن ہے گلستاں میں

مجھے بخشا وہ احساسِ بسیط آئینِ مستی نے
کوئی فرق اب نہیں روزِ وصال و شامِ ہجراں میں

نظر آتا ہے کچھ تشنہ سا حُسنِ کائنات ابتک
ابھی شاید کوئی خم رہ گیا ہے زلفِ جاناں میں

گریباں ہے نہ دامن اب تو کچھ باقی نہیں اختر
نہ جانے پھر یہ کیوں جنبش سی ہے نبضِ گلستاں میں

(۶۴)

ناشاد ہے دل ناکام نظر دم بھر بھی تو اطمینان نہیں
جینے کی تمنائیں ہیں بہت جینے کے مگر سامان نہیں

آلام کی سرکش موجوں کو رگ رگ میں پر افشاں ہونے دے
آسائشِ دنیا ممکن ہے آسائشِ دل آسان نہیں

گلشن ہو کہ بزمِ نغمہ و مئے ہوتی ہے مجھے کچھ وحشت سی
یا میں ہی نہیں اس عالم میں یا حسن کی اب وہ شان نہیں

آرامِ مسلسل کا شکوہ کچھ مجھ کو نہیں روتا ہوں اِسے
تھم تھم کے جو دل میں اُٹھتا تھا اس درد کا اب امکان نہیں

آباد ہے خود آگاہی کے سائے میں حقیقت کی دنیا
وہ رازِ حقیقت کیا جانے اپنی بھی جسے پہچان نہیں

ہر پھول ہے اک دنیائے طرب ہر ذرہ میں لاکھوں جلوے ہیں
جس تابِ نظر کی حاجت ہے حاصل وہ تجھے نادان نہیں

وہ مستِ الست اختر جس کی ہر سانس رہینِ میکدہ ہو
اس پر یہ گمانِ ہوش و خرد اتنی بھی تجھے پہچان نہیں

(۶۵)

بے خودِ شوق ہوں گم کردۂ اوہام نہیں
میری دنیا میں یہ رقصِ سحر و شام نہیں
توڑ دے دل میں کوئی تیز سا نشترِ مطرب
روح خوابیدہ ہے نغموں کا یہ ہنگام نہیں
عشق نے کی ہے عطا وہ نگہہ نکتہ شناس
میرے آغاز کو اب خطرۂ انجام نہیں
چند بکھرے ہوئے اجزا ہیں سو وہ بھی تاریک
زندگی کیا ہے جو مجموعۂ اوہام نہیں
ایک احساسِ لطافت ہی خوشا فیضِ جنوں
خلشِ درد کا اب دل میں کہیں نام نہیں
یا تو وہ شوخ نگاہی تھی کبھی، یا یہ حجاب
ناوکِ غمزہ نہیں نشترِ پیغام نہیں!!
زندگی نام ہے رسوائیٔ دل کا اختر
یہ بھی ہے موت کی اک شکل جو بدنام نہیں

(۲۶)

زہر ہے موجِ بادہ بھی عرصۂ امتیاز میں
ذوقِ نشاط ہے تو آ عالمِ سوز و ساز میں

اُس کی تلاش ہے مجھے رہگزرِ مجاز میں
حُسن بھی اک حجاب ہے جسکے حریمِ ناز میں

واہ رے زخمِ جانفزا، واہ رے لذّتِ جفا
اب بھی ہے جی پڑا ہوا ناوکِ دلنواز میں

شمع سے کس نے کہدیا عشرتِ سرمدی کا راز
سوز میں اک نشاط ہو کیف ہو اک گداز میں

عقل ہے پھر حریفِ عشق اب یہ بساط اُلٹ نہ دو
پردہ اُٹھا کے آ نہ جاؤ عالمِ امتیاز میں

مطربِ خوشنوا مجھے نشترِ تیز چاہیئے
یہ تو نوائے درد ہی نغمہ کہاں ہی ساز میں

ان کی نگاہِ دلنواز صورت و معنیٔ مجاز
ان کی ادائے عشوہ ساز پردۂ امتیاز میں

ہوش کہاں کہ یاد ہو شرحِ سکون و اضطراب
عشق نے کچھ کہا تو تھا مجھ سے زبانِ راز میں

حُسن اسیر ہی جہاں، عشق بسیط و بیکراں
ایسے بھی کچھ مقام ہیں مرحلۂ نیاز میں

اختر ناتمام ہے عشق کا فیض دیکھیئے
عالمِ وجد و حال ہیں حلقۂ سوز و ساز میں

(٦٧)

ازل سے ہے یہی صبر آزما گردشِ زمانے کو
سمجھتے ہیں وہ اب تک کھیل شاید آزمانے کو

ستانے سے مرے فرصت تو مل جائے زمانے کو
چلوں خود بجلیوں کی نذر کردوں آشیانے کو

یہاں تو گلستاں بھی بیم گردش سے نہیں خالی
نہ جانے پھول کیا سمجھے ہوئے ہیں مسکرانے کو

سلیقہ تھا کسے اس انجمن میں سوزِ باطن کا
حقیقت کر دیا میں نے محبت کے فسانے کو

اِدھر ڈوبا ہوا میں فکرِ تعمیرِ نشیمن میں
فلک تیار بیٹھا ہے اُدھر بجلی گرانے کو

وہی کچھ خواب ہونگے اور کچھ اوہامِ بیداری
جہاں سے چھیڑئے کمبخت دنیا کے فسانے کو

جو ہمت ہو تو آئیں سامنے ارض و سما اخترؔ
وہ اٹھے ہیں مرا ظرفِ محبت آزمانے کو

(۶۸)

مختلف آلام میں بے سازو سامانی کے ساتھ
زندگی وابستہ ہے گویا پریشانی کے ساتھ

اک ذرا حدِّ تعیّن سے قدم آگے بڑھا
غور کر! انوارِ دانش بھی ہیں نادانی کے ساتھ

زندگی کیا ہے، جو دل ہو تشنہ، ذوقِ فنا
یعنی یہ پردہ تو اُٹھ سکتا ہے آسانی کے ساتھ

شوق محدود، اور وہ جلوے بہار اندر بہار
آرزوئے مرحمت اس تنگ دامانی کے ساتھ

تم نے ہر ذرّے میں برپا کر دیا طوفانِ رنگ
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کے ساتھ

گفتگوئے صورت و معنی ہے عنوانِ حیات
کھیلتے ہیں وہ مری فطرت کی حیرانی کے ساتھ

دل کی آبادی ہے اخترؔ دل کی بربادی کا نام
اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

(۶۹)

نہیں کہ عرضِ تمنّا وہاں سنی نہ گئی
مجھی سے جرأتِ اظہارِ شوق کی نہ گئی

رہا خودی میں بھی احساس ناتمامیٔ عقل
خدا ہوئے تو مگر شانِ بندگی نہ گئی

بکھر کے خاک ہوئے گرچہ عشق کے اجزا
مزاجِ حسن سے پھر بھی تو برہمی نہ گئی

نقاب اُٹھتے ہی رُخ سے جھپک گئیں آنکھیں
حدیثِ شوق نگاہوں سے بھی کہی نہ گئی

فریبِ ہوش نے اُلٹی بساطِ عیشِ دوام
نگاہ تا سرِ آئینِ بیخودی نہ گئی

کچھ اس نگاہ سے دیکھا تھا مجھ کو ساقی نے
چھٹی شراب مگر شانِ بیخودی نہ گئی

ہزار مرتبہ آئی اگرچہ موت اختؔر
بایں ہمہ خلشِ دردِ زندگی نہ گئی

(۷۰)

دل میں جنبش یہ سمجھ میں نہیں آتا کیوں ہے
زیست مجروح ہے اتنی تو یہ جینا کیوں ہے

مسکراتے ہیں سرِ خاک ہزاروں جلوے
بے حجابی کا یہ عالم ہے تو پردا کیوں ہے

شرحِ اسرارِ تمنا ہے اگر ناکامی
دل میں آباد پھر احساس کی دنیا کیوں ہے

میری وحشت ہے اگر مانعِ عرفانِ جمال
حیرتِ آئینہ ای حُسنِ خود آرا کیوں ہے

اشکِ پیہم سے ہے جب خود رگِ ہستی نمناک
دل میں پھر گرمیٔ شوقِ مے و مینا کیوں ہے

حُسنِ تکمیل سے محروم ہے جب روئے حیات
عشق کیا ہے یہ ہجومِ غمِ دنیا کیوں ہے

دل میں جب زیست کے احساس نے دم توڑ دیا
اتنی بیتاب پھر اب نبضِ تمنا کیوں ہے

جب عناصر میں نہیں شرکتِ اجزائے طرب
پھر مرے جام میں یہ لرزشِ صہبا کیوں ہے

عجزِ دانش ہے نقابِ رخِ عرفاں اختر
کون سمجھے گا یہ اسرار کہ ایسا کیوں ہے

(۷۱)

صبح ہے، وہ ہیں، زیبِ دوش گیسوئے شب سرشت ہے
صحنِ چمن ہے، اے خدا یا یہ کوئی بہشت ہے

مہر مبیں سے کم نہیں ذرۂ رہگزار بھی
اور تری نظر ہنوز رفتۂ خوب و زشت ہے

جورِ سکوں ربا نہیں خیر وہ امتحاں سہی
تیرے نثار سوچ تو دل ہے کہ سنگِ خشت ہے

کھوئے ہوئے ہیں اہلِ عقل حیرتِ بے قیاس میں
مسئلۂ حیات بھی عقدۂ سرنوشت ہے

اخترِ نامراد اس مستی و کیف کے نثار
ان کی نگاہِ دلنواز حاصلِ صد بہشت ہے

(۷۲)

شبِ غم صبح کے آثار میں گم ہوتی جاتی ہے
زہے فطرت! فغاں رازِ ترنم ہوتی جاتی ہے

غمِ پنہاں دئے جاتا ہے دل کو درسِ بیداری
اب اس قطرہ کی ہستی رشکِ قلزم ہوتی جاتی ہے

نہیں اے ہم نفس بے وجہ میری گریہ سامانی
نظر اب واقفِ رازِ تبسم ہوتی جاتی ہے

جہاں افسانۂ ہستی میں ہے الجھا ہوا اختر
حقیقت پردۂ اسرار میں گم ہوتی جاتی ہے

(۷۳)

ہوش میں ہوں کہ اے خدا یہ بھی مرا جنون ہے
دل میں ہے کچھ خیال سا، آج مجھے سکون ہے

آپ سمجھ رہے ہیں آہ، آپ سمجھ رہے ہیں اشک
یہ مرے دل کی روح ہے، یہ مرے دل کا خون ہے

آ ہی چکی تھی لب پہ جان ایسے میں کیوں وہ آگئے
اے غمِ انتظارِ مرگ یہ تو بُرا شگون ہے

رازِ حیات کھل سکا کچھ بھی نہ اخترِؔ حزیں
ہوش ہے یہ کہ بیخودی، عقل ہے یا جنون ہے

(۴۷)

میں جی رہا ہوں یہ زندگی ہے، اگرچہ اب زندگی کہاں ہے
کہ ہر نفس میں چھپی ہوئی تازہ تر مصیبت کی داستاں ہے

جو بچ سکا حسرتوں کی زد سے اسی نے رازِ نشاط سمجھا
رہا جو بیگانۂ مسرت وہی حقیقت میں شادماں ہے

یہ ناشناسِ جمالِ معنی فریبِ صورت میں کھو گئے ہیں
کہ جستجو کر رہے ہیں جس کی خود ان کی نظروں میں وہ نہاں ہے،

سپاسِ غم روز و شب ادا کر کہ ہے یہی رازِ شادمانی
بہار کچھ بھی نہیں، یہ نکھرا ہوا سا اک جلوۂ خزاں ہے

حیات اک دردِ مستقل ہے خیالِ آسودگی نہ کرنا
کہ اتنی غفلت بھی دیکھ ناداں ضمیرِ احساس پر گراں ہے

حیات صبر آزما نہ ہوگی یہ کچھ دنوں کی ہے بات اخترؔ
کہ تیری ناکامیاں نہیں ہیں ترے ارادوں کا امتحاں ہے،

(۵)

سنی اُس نے یوں میرے دل کی کہانی
نگاہیں ملیں مسکرائی جوانی

بہ اندازۂ ظرف ہے زندگانی
نہ فانی ہوں میں اور نہ میں جاودانی

اب اُن پر ہے اک عالمِ شوق طاری
بڑی کام آئی مری بے زبانی

تمھاری نگاہوں نے یہ راز کھولا
کہ اب سرمدی ہو گئی عمرِ فانی

نہ ہستی ہی کچھ ہے نہ کچھ رازِ ہستی
پلا ساقیا! بادۂ ارغوانی

میں اک پرتوِ ذات ہوں بے تکلف
کہ میرا نشاں ہے تری بے نشانی

کچھ اس طرح دل رہ گیا تجھ کے اختر
کہ وہ سرخوشی ہے نہ وہ سرگرانی

(۷۶)

اسیرِ زمان و مکاں ہو گئی
مری زندگی رائگاں ہو گئی

قفس سے بھی کچھ بڑھ کے صبر آزما
مری حسرتِ آشیاں ہو گئی

غمِ دل نے توڑا طلسمِ امید
ہر امید وہم و گماں ہو گئی

کرم کیجئے اب کرم کیجئے
بہت کوششِ امتحاں ہو گئی

چلو خیر تم پا گئے رازِ دل
تمھاری نظر راز داں ہو گئی

وہ اختؔر جو گیسو بدوش آ گئے
مری ہر تمنّا جواں ہو گئی

(۷۷)

اللہ یہ کوئی زندگی ہے
جو اُن سے بچھڑ کے کٹ رہی ہے

مئے ہے، مینا ہے، بیخودی ہے
دنیا مرے پاؤں چومتی ہے

جتنی ہے قریب منزلِ یار
اے دل اتنی ہی دور بھی ہے

جب میں نے سنا ہے نام اُن کا
دل پر اک چوٹ سی لگی ہے

کھلتے ہیں یہاں رموزِ باطن
میخانہ جہانِ بیخودی ہے

وہ ہیں اور اک ہجومِ عشرت
میں ہوں اور میری بیکسی ہے

اختؔر اک زخمِ نو مبارک
کچھ درد میں آج پھر کمی ہے

(۷۸)

ہر جلوہ کہ آرائشِ گلشن کے لئے ہے — اک برقِ بلا میرے نشیمن کے لئے ہے

ہے وحشتِ دل اصل میں سرمایۂ ایجاد — جو چاک ہے گویا مرے دامن کے لئے ہے

سنتا ہوں کہ آتی ہے بہارِ چمن آرا — بجلی کوئی بیتاب نشیمن کے لئے ہے

روتا ہوں کہ بیگانۂ تکمیل ہے اب بھی — وہ بے اثری جو مرے شیون کے لئے ہے

کیا جان سکیں اہلِ گلستاں اُسے اخترؔ
جو غم کسی محرومِ نشیمن کے لئے ہے

(۷۹)

منزلِ ہستی کی عبرت دیکھ لی — اے مجاز اپنی حقیقت دیکھ لی

یہ معمّہ عشق نے حل کر دیا — رنج کے پہلو میں راحت دیکھ لی

مجھ تک آیا اور نہ آیا دورِ جام — چشمِ ساقی کی مروت دیکھ لی

صبح شامِ وصل کا عالم نہ پوچھ — ہم نے دنیا میں قیامت دیکھ لی

اخترؔ اُن کے حسنِ رنگیں کی قسم
میں نے اس دنیا میں جنت دیکھ لی

(۸۰)

آ، عشرتِ کونین سے بیگانہ بنا دے
اپنی نگہہ مست کا دیوانہ بنا دے
عقلِ غلط اندیش سے بیگانہ بنا دے
اے عشقِ خدارا مجھے دیوانہ بنا دے
چاہے تو گدائے درِ میخانہ کو ساقی
اک جام میں سر حلقۂ میخانہ بنا دے
میں تشنہ ہوں اُس نغمۂ بیدار کا مطرب!
جو رازِ حقیقت کو بھی افسانہ بنا دے
غم حد سے گذرنے کو ہے مئے دے مجھے ساقی!
دل ٹوٹ رہا ہے اسے پیمانہ بنا دے
لب تشنۂ جامِ مئے اسرار ہے دنیا
آ اور اسے بزمِ حریفانہ بنا دے
یہ ابر، یہ راتیں، یہ ہوا کاشکہ اختؔر
وہ شمع بنے اور مجھے پروانہ بنا دے

(۸۱)

عیاں جتنی زمانے کی حقیقت ہوتی جاتی ہے
خود اپنی زندگی سے مجھ کو نفرت ہوتی جاتی ہے

سکوں ملتا ہے مجھ کو ہم نفس بیتاب رہنے میں
مری آشفتگی اب میری فطرت ہوتی جاتی ہے

رہی ہے اس قدر میری رفیقِ شامِ تنہائی
کہ مجھ کو نامرادی سے محبّت ہوتی جاتی ہے

بہت دن سے بھٹکتا پھر رہا ہوں ایسی راہوں میں
کہ ہر جنبش مری اک درسِ عبرت ہوتی جاتی ہے

عروسِ زندگی کو ناز تھا جس خلوتِ دل پر
وہی اب میرے ارمانوں کی تربت ہوتی جاتی ہے

گئے وہ دن قفس میں جب نشیمن یاد آتا تھا
کہ اب مجھ پر عیاں اپنی حقیقت ہوتی جاتی ہے

خیالِ حسن میں آنکھوں سے پردے اُٹھتے جاتے ہیں
مری خود رفتگی رازِ بصیرت ہوتی جاتی ہے
نہ جانے چلتے چلتے کس نظر سے اُس نے دیکھا تھا
کہ غم کی ہر خلش احساسِ راحت ہوتی جاتی ہے
نگاہِ مستِ ساقی خود پلاتی ہے مجھے اخترؔ
یہ میری بادہ آشامی عبادت ہوتی جاتی ہے

(۸۲)

سوئے گردن نگاہ کرلی — اُمڈا جب دل اک آہ کرلی
وہ جلوۂ بے حجاب دیکھا — حسرت بھری اک نگاہ کرلی
حیرت ہی سہی اگر نہیں حُسن — آئینہ سے رسم و راہ کرلی
اس درد پذیر دل کے ہاتھوں — اپنی دنیا تباہ کرلی
گھبرائے جو بیکسی سے اپنی
اخترؔ چپکے سے آہ کرلی

(۸۳)

پھر وہی حشرِ دل آزاری ہے
پھر وہی میں ہوں وہی خواری ہے

موت ہے دہر کا عرفاں کیا ہے
عقل اک طرح کی بیماری ہے

خوابِ ہستی کی ملی اب تعبیر
یہ محبت ہے کہ بیداری ہے

موجِ مئے ہے کہ تصور اُن کا
ہر نفس دعوتِ سرشاری ہے

بادۂ عشق کی تاثیر نہ پوچھ
نشہ سا روح پر اک طاری ہے

اُڑتی پھرتی ہے مری خاکِ تباہ
اب تک آئینِ ستم جاری ہے

شیوۂ اہلِ زمانہ اخترؔ
سرد مہری ہے ستمگاری ہے

(۸۴)

اب دیر کیا ہے آخر اے مرگِ ناگہانی
بکھرے ہوئے پڑے ہیں اجزائے زندگانی

پروانہ اس کو سنتا اور خاک ہو نہ جاتا
روودادِ سوزِ باطن، پھر شمع کی زبانی!

ہر وقت چھا رہا ہے اک نزع کا سا عالم
اے اختیار مجھ پر یہ جبرِ ناتوانی؟

کس سے کہوں کہ کیا ہوں مٹتا سا اک نشاں ہوں
اللہ رے ناتمامی اللہ رے ناتوانی

ہر پھول سرمدی ہے اب میری گلستاں کا
کھولے ہیں غم نے مجھ پر اسرارِ شادمانی

دنیا کی شورشوں سے مرجھا چلی ہیں نبضیں
ہاں مطربِ محبت اک نغمۂ جوانی

اے عشق تجھ سے پہلے یہ بزمِ رنگ و بو تھی
اک خواب کا سا عالم، غمگیں سی اک کہانی

اس رازِ کو زباں کا ہلکا سا مس ہے مہلک
آنکھوں میں ہو رہی ہے شرحِ غمِ نہانی

قربانِ عشق اختر حسن نے یہ راز کھولا
اک موجِ سرمدی ہے نبضِ حیاتِ فانی

(۸۵)

اک محیط احساس اک شوقِ نمایاں چاہیے
عشق کی نبضوں میں رقصِ موجِ طوفاں چاہیے

ایک مرکز پر حیاتِ عقل و عرفاں چاہیے
ترکِ ایماں چاہیے تکمیلِ ایماں چاہیے

اک نئی ہستی، نئی تعمیرِ دوراں چاہیے
میں ترے قرباں پھر اب تجدید پیماں چاہیے

تجھ کو اے دانش مبارک ہو ترا خوابِ سکوں
عشق کے اجزاء کو اک رقصِ پریشاں چاہیے

اک فریبِ رنگ و بو ہے یہ ہجومِ رنگ و بو
ہم نوا تیری نگاہوں میں گلستاں چاہیے

لے تری بسمل کو زخمِ دل گوارا ہو گیا
اور اب کیا تجھ کو ای حُسنِ پشیماں چاہیے

عشق اک خوابِ پریشاں ہے تو ہو ناصح مگر
میری آنکھوں کو یہی خوابِ پریشاں چاہیے

حُسن کی فطرت حجاب اور بے حجابی خوئے عشق
اُن کو دامن چاہیے مجھ کو گریباں چاہیے

زخمِ دل سے بھی نہیں ہوتی مری تسکینِ ذوق
تیز سا نشتر کوئی رگ رگ میں پنہاں چاہیے

موت کے اسرار سے ای عشق الٹ دے اب نقاب
منظرِ ہستی کا یہ رُخ بھی نمایاں چاہیے

کر دیا اختر جنوں نے بے نیازِ نام و ننگ
اب گریباں چاہیے مجھکو نہ داماں چاہیے

اُف یہ انداز دلربائی کے
تم سزاوار ہو خدائی کے

ڈوبتی جا رہی ہے نبضِ حیات
صدقے اس دیر آشنائی کے

اک ترے زیرِ لب تبسّم میں
سیکڑوں راز ہیں خدائی کے

طرفہ تر ہے کہ میری قسمت کو
مجھ سے شکوے ہیں نارسائی کے

اب مری جستجو میں ہے منزل
کیا صلے ہیں شکستہ پائی کے

قصرِ دارا ہے آستانۂ فقر
اے میں قربان اس گدائی کے

ہے وہی اہتمامِ جلوہ ہنوز
اُن کو ارماں ہیں خود نمائی کے

بر سرِ لطف ہیں وہ اب اخترؔ
دن گئے صبر آزمائی کے

(۸۷)

نہ کہئے ہمارا اشارا نہیں ہے
مجھے دردِ دل ناگوارا نہیں ہے

نمایاں ہوں کیوں کر خد و خالِ ہستی
ابھی رازِ غم آشکارا نہیں ہے

یہ اجزائے ہستی ہیں کیوں ناشکیبا
جو اس میں تمھارا اشارا نہیں ہے

تمھارا ہے جو دونوں عالم ہیں اس کے
کہیں کا نہیں جو تمھارا نہیں ہے

جھلک اس کی اک جلوۂ سرمدی ہے
یہ آنسو ہے کوئی ستارا نہیں ہے

تغیّر پہ چلتا نہیں بس کسی کا
زمانہ تمھارا ہمارا نہیں ہے

اجل ہے تو پھر کیوں کہوں میں یہ اخترؔ
مری زندگی کا سہارا نہیں ہے

(۸۸)

صِلۂ عشق، بیکسی ہی سہی
بادہ عنوانِ تشنگی ہی سہی

میں جنونِ خرد سے باز آیا
زندگی نذرِ بیخودی ہی سہی

ستمِ ناروا کی اک حد ہے
اے وہ اندازِ دلبری ہی سہی

میں یقینِ کرم پہ ہوں مجبور
وہ سراپا ستمگری ہی سہی

اُن کا ملنا اگر نہیں ممکن
خلشِ دردِ نارسی ہی سہی

وہ اِدھر مسکرا کے دیکھ تو لیں
اک ادائے فسونگری ہی سہی

چارہ کیا ہے سوائے صبر اختؔر
نہ سہی موت زندگی ہی سہی

عہ میں ایطاء کا پابند نہیں ہوں ۱۲

(۸۹)

آج پھر شرحِ تمنّا ہو گی
ہر نگہ محشر بر پا ہو گی

کروٹیں لیتی ہے پھولوں میں شراب
ہم سے اس فصل میں توبہ ہو گی

حشر آئے گا نہ جانے کب تک
زندگی اور ابھی رسوا ہو گی

چاہیے دل میں رہے حسرتِ دل
لب تک آئے گی تو رسوا ہو گی

ابرِ تر جھوم کے اُٹھّا ساقی
دعوتِ ساغر و مینا ہو گی؟

آگیا موسمِ گُل پھر اخترؔ
جام میں لرزشِ صہبا ہو گی

(۹۰)

وہی کمالِ مصوّر میں رنگ بھرتا ہے
وہ ایک نقش جو صدیوں کے بعد اُبھرتا ہے

وعیدِ موت ہے وعدہ حیاتِ سرمد کا
ترے خیال کی دنیا میں کون مرتا ہے

یہ کس کے جلوۂ مطرب نے ساز چھیڑ دیا
کہ ذرّہ ذرّہ زمانے کا وجد کرتا ہے

بساطِ ہستئ موہوم کیا، اُلٹ دیجے
اسی طرح کوئی جلوہ اگر نکھرتا ہے

فنائے ذات میں ہے رازِ ہستئ سرمد
جو ڈوبتا ہے وہ دریا کے پار اترتا ہے

خدا ہی رحم کرے حالِ زارِ اخترؔ پر
وہ بدنصیب کہ جیتا ہے اور نہ مرتا ہے

—(۹۱)—

پھر سکونِ دل کا شیرازہ پریشاں کر گئے
خواب میں آئے بھی اور آنے کا پیماں کر گئے

عشق کی غم آشنا فطرت کو حیراں کر گئے
خاکِ دل پر یوں نظر ڈالی گلستاں کر گئے

مطربِ عشق اللہ اللہ تیرے نغموں کا جلال
ہستیٔ محدود کو بے حد و پایاں کر گئے

بن سکا درمانِ محرومی نہ ان کا التفات
تھم گئے آنسو مگر آنکھوں کو ویراں کر گئے

مسکرائے یوں مری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر
وہ مری فطرت کی حیرانی کو عرفاں کر گئے

کھیل تھے کچھ آرزوؤں کے اہل کا کیا قصور
جو مجھے منت کشِ عمرِ گریزاں کر گئے

اہلِ دانش کو مگر سمجھا گئے رازِ بہار
اُن کے دیوانے کہ دامن کو گریباں کر گئے

اُن کا صدقہ ہے یہ ساری رونقِ بزمِ حیات
اک اشارے میں جو ذروں کو بیاباں کر گئے

اے میں قرباں جب بڑھا اخترؔ غمِ صبر آزما
خود وہ آئے اور مری مشکل کو آساں کر گئے

(۹۲)

محبت اک ادائے خاص سے دیوانہ کرتی ہے
حیاتِ شمع تحصیلِ غمِ پروانہ کرتی ہے

فریبِ صورتِ عالم نہیں بے جلوۂ معنی
حقیقت خود اسے افسانہ در افسانہ کرتی ہے

تماشا دیکھ تو بھی محتسب اس شانِ رحمت کا
گھٹا اُٹھتی ہے جو، رُخ جانبِ میخانہ کرتی ہے

فنا کے سلسلے میں زندگی کے ناز اٹھاتا ہوں
حرم کی آرزو منت کشِ بت خانہ کرتی ہے

حریفِ اعتبار و حُسن عرفاں نام ہے جس کا
عیاں وہ رازِ مستی گردشِ پیمانہ کرتی ہے

تمنائے فنا سے کیا تعلق نامرادی کا
کروں کیا، زندگی تجھ سے مجھے بیگانہ کرتی ہے

خدا شاہد ہے اختر اُن کی آنکھوں میں عیاں دیکھی
وہ کیفیت، جو دل کو روکشِ میخانہ کرتی ہے

(۹۳)

کبھی اُٹھی تھیں دل میں چند موجیں شادمانی کی
اب اتنی یاد ہے افسانہ عہدِ جوانی کی

حدیثِ درد کو حاجت نہیں حُسنِ بیانی کی
کہ دیوانے، محبت خود زباں ہے بے زبانی کی

غلط سمجھا ہے موجِ گل نے آئینِ چمن بندی
یہاں ذروں میں بھی اک روح ملتی ہے روانی کی

اشاراتِ نظر سے رازِ پنہاں کھولے جاتے ہیں
کوئی حد ہے زبانِ عشق میں نازک بیانی کی

طرازِ روح ہے اجزائے ہستی کا بکھر جانا
فنا ہو جا، جو خواہش ہے حیاتِ جاودانی کی

نہ جانے اس ہجومِ یاس نے کیا کر دیا اختؔر
کہ شوقِ مرگ ہے دل میں نہ حسرت زندگانی کی

(۹۴)

لذّتِ غم التفاتِ یار نے برباد کی
ترکِ بیداد آہ اک تمہید تھی بیداد کی

اب قفس میں پائمالِ حسرتِ مجبور ہوں
آشیانے میں جفائیں تھیں غمِ آزاد کی

عشق نے پہلے تو یکجا کر لئے اجزائے حُسن
اور پھر دنیا میں اک دنیا نئی آباد کی

فطرتِ بیدار جھومی حُسن کو وجد آگیا
عشق نے اس لطف سے شرحِ وفا ارشاد کی

شانہ لے کر کھولنے بیٹھے ہیں وہ زلفوں کے خم
ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں عالمِ ایجاد کی

مسکرائے وہ مجھے یاد آگیا پیمانِ ضبط
رہ گئی شرما کے گستاخی لبِ فریاد کی

ایک نقطے پر نظر آتے ہیں اخترؔ عیش و غم
زندگی اک شکل ہے یکجائی اضداد کی

(۹۵)

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
مٹ گیا میں انھیں خبر نہ ہوئی

کچھ نہیں پھر بھی اک قیامت ہے
زندگی اور مختصر نہ ہوئی

عقل، با وصفِ جستجوئے تمام
رازِ ہستی سے باخبر نہ ہوئی

کیا زمانے کو یاد رکھیں گے
چار دن چین سے بسر نہ ہوئی

یاس نے کر دیا فسانہ تمام
آس بھی دل کی چارہ گر نہ ہوئی

جب سے آئی تمھارے ہجر کی رات
میری دنیا میں پھر سحر نہ ہوئی

چرخ، نالوں سے کانپ اُٹھا اخترؔ
حُسنِ مغرور کو خبر نہ ہوئی

(۹۶)

سانس بکھری منتشر اجزائے امکاں ہو گئے
خاک کے ذرّے ہواؤں میں پریشاں ہو گئے

آپ اک جلوہ دکھا کر خود تو پنہاں ہو گئے
یہ بھی دیکھا کس قدر دامن گریباں ہو گئے

میں نے کب چاہا تھا رسوائی کے ساماں ہو گئے
اُن کے جلوے میری ہستی میں نمایاں ہو گئے

لوٹ کر مرکز کی جانب مجھ کو آنا ہی پڑا
رات گزری شمع کے جلوے پریشاں ہو گئے

غم نے رکھّا کُھل چکا تھا ورنہ ہستی کا بھرم
وہ تو یہ کہیے کہ خود ذرّے بیاباں ہو گئے

تشنۂ ذوقِ جراحت ہی اگر اب دل تو ہو
جتنے نشتر تھے وہ سب صرفِ رگِ جاں ہو گئے

میں اُٹھاتا پردۂ اسرار میری کیا مجال
خود وہ جلوے دل کے اجزائے پریشاں ہو گئے

اب نہ وہ دل ہے نہ ویسے آنسوؤں میں آب و تاب
چند قطرے تھے لہو کے زیبِ مژگاں ہو گئے

اس تکلف سے ملایا سازِ مطرب کے نثار
دل کے سب کانٹے گلستاں در گلستاں ہو گئے

دل سے تھا ہنگامۂ ہستی اب اخترؔ دل کہاں
ساز اِدھر ٹھیرا اُدھر نغمے پریشاں ہو گئے

(۹۷)

سلامت، مرے دل میں گھر کرنے والے
مرے غم کو پائندہ تر کرنے والے

بھنور کو سمجھتے ہیں دامانِ ساحل
حوادث پہ گہری نظر کرنے والے

وہ نغمے سُنا آج پھر حُسنِ مطرب
حقائق کو زیر و زبر کرنے والے

دو عالم کو اک نقشِ پا جانتے ہیں
تری رہ گزر میں بسر کرنے والے

خدا اُن کی نظروں سے اخترؔ بچائے
یہی تیر ہیں دل میں گھر کرنے والے

(۹۸)

دلوں میں آگ بھری ہے غمِ نہانی کی
بہت گراں ہے یہ قیمت حیاتِ فانی کی

اُلٹ چکی تھی کبھی کی بساطِ عشرت و رنگ
جنونِ عشق نے تعمیرِ شادمانی کی

ہنوز دل میں ہے اک پرتوِ نشاطِ دوام
بہت قلیل تھیں گو ساعتیں جوانی کی

ترے مریضِ محبّت کی اُف رے مجبوری
دعا نہ مانگ سکا مرگِ ناگہانی کی

فنا ہوئے تو کھُلا رازِ ہستئ موہوم
ملی ہے راہ کہاں عمرِ جاودانی کی

یہ راز اہلِ محبت سے پوچھیے یعنی
اجل بھی ایک حقیقت ہے زندگانی کی

قمر[۱] کا ظلم نہیں ہے تو کیا ہے پھر اختر
کہ اب وہ دل نہ امنگیں وہ شعر خوانی کی

---

[۱] حبیبی مولوی حمید الدین قمر سنبھلی مہتمم ادارۂ شرقیہ حیدر آباد۔

(۹۹)

مجھے مل چکا سکون اب خلشِ غمِ نہاں سے
شبِ انتظار! لاؤں انھیں ڈھونڈھ کر کہاں سے

مرے دل کی زندگی ہے، خلشِ غمِ نہاں سے
یہ نہیں تو باز آیا میں حیاتِ جاوداں سے

میں قفس میں ہوں، خدارا کوئی جا کے دیکھ لیتا
کہ دھواں سا اُٹھ رہا ہے مری شاخِ آشیاں سے

مرا شکوۂ مقدر تمھیں ناگوار کیوں ہو
کوئی یہ بھی رازِ دل ہے کہ نکل گیا زباں سے

میں ہدف رہا ازل سے ترے تیرِ بے خطا کا
میں ہزار بار گزرا تری حدِّ امتحاں سے

الم آفریں ہو کیونکر نہ فسانہ زندگی کا
کہ یہ سلسلہ ملا ہے مرے دل کی داستاں سے

مرے سازِ دل میں اختر کوئی اور نغمہ کیسا
وہی اک نوائے غم ہے اسے چھیڑیئے جہاں سے

(١٠٠)

ظہورِ جلوہ فریبِ خیال ہوتا ہے
کہاں کی دید، تصوّر محال ہوتا ہے

فریبِ رنگ پہ قائم ہے دہر کی بنیاد
خیال محوِ طلسمِ خیال ہوتا ہے

یہ بیقرار نگاہیں، یہ بات بات میں چھیڑ
اسی ادا پہ تو جینا محال ہوتا ہے

حدیثِ درد میں بھی اب تو جی نہیں لگتا
یہ ذکر گرچہ مرے حسبِ حال ہوتا ہے

سوالِ محرمیِ رازِ کائنات نہیں
خود اپنی ذات کا عرفاں محال ہوتا ہے

حریمِ ناز میں چھیڑا مرے سکوت نے ناز
عجیب چیز لبِ بے سوال ہوتا ہے

کمال کس کو ملا، کچھ اگر کسی کو ملا
تو ایک پرتوِ حُسنِ کمال ہوتا ہے

گزر رہا ہوں محبت کی اُس بلندی سے
جہاں تصورِ ممکن محال ہوتا ہے

تم اُن کی یاد میں رہتے ہو مضطرب اختر
مگر انھیں بھی تمھارا خیال ہوتا ہے

(۱۰۱)

کہاں حُسن کو فرصتِ یاد ہے
یہ خود عشق سرگرم بیداد ہے

دل اُس کیف و مستی سے آباد ہے
کہ اب یاد ہے اور نہ فریاد ہے

قفس میں بھی ہے آشیانے کا لطف
مقیّد ہوں میں، دل تو آزاد ہے

پھر اک نشترِ تیز اے یادِ یار
مجھے دعوئ ضبطِ فریاد ہے

بقدرِ محبّت نہیں التفات
بہ اندازۂ شوق بیداد ہے

کہاں میں کہاں قید و بندِ حیات
کہ میری ہر اک سانس آزاد ہے

مبارک ہیں اُس دل کی ویرانیاں
جو تیرے تصور سے آباد ہے

مرا دل بھی زندہ تھا ہمدم کبھی
مگر اب تو یونہی سا کچھ یاد ہے

یہ احساں ہے اختؔر غمِ یار کا
کہ میں شاد ہوں دل بھی آباد ہے

(۱۰۳)

ہجر میں ہے یہ زندگی میری
مجھ کو روتی ہے بیکسی میری

اس نے مشکل سے کی تھی ایک نظر
اور دنیا الٹ گئی میری

اب فریبِ کرم سے کیا حاصل
جان ہونٹوں پہ آچکی میری

جانتا ہوں فریبِ گردشِ رنگ
سرگرانی ہے سرخوشی میری

محرمِ رازِ میکدہ ہوں میں
شرحِ عرفاں ہے بیخودی میری

کیوں فریبِ امید کھاؤں میں
آپ میرے نہ زندگی میری

غم نے مرجھا دیا ہے دل اخترؔ
اب کہاں وہ شگفتگی میری

(۱۰۳)

عشق بھی حقیقت میں کیفِ جاودانی ہے
حُسن کی جوانی پھر حُسن کی جوانی ہے

سازِ غم کے پردوں میں رازِ شادمانی ہے
یعنی اِس کا ہر نغمہ موجِ زندگانی ہے

کاوشیں غمِ دل کی ختم ہو چکیں شاید
آج ڈوبتی سی کچھ نبضِ ناتوانی ہے

ایک نقشِ مبہم ہے گرچہ منظرِ ہستی
لیکن اے غمِ ہستی تُو تو جاودانی ہے

اب ترے تبسم کی یاد ہی میں جیتا ہوں
اب ترا تصور ہی وجہِ زندگانی ہے

غم کی داستاں میں تھی کس قدر دلآویزی
جس نے جب سنی سمجھا میری ہی کہانی ہے

کانپتی ہیں ہونٹوں پہ مضمحل سی کچھ آہیں
عیشِ عہدِ رفتہ کی اب یہی نشانی ہے

نطق بخشنے والے آج شرم رہ جائے
سرگزشتِ دل ہے اور میری بےزبانی ہے

گرمِ رقص ہیں اختر ناتمام سے اجزاء
زندگی حقیقت میں خوابِ زندگانی ہے

(۱۰۴)

بیٹھا ہوں دولتِ غمِ جاناں لئے ہوئے
کونین زیرِ گوشۂ داماں لئے ہوئے

سر ہو سکی نہ اہلِ ہوس سے نبردِ عشق
ہر فتح ہے شکست کا عنواں لئے ہوئے

اُٹھا ہے میکدے سے ہر اک رندِ مئے پرست
آنکھوں میں اک تجلیِ عریاں لئے ہوئے

آرائشِ جمال کی خاطر چلا ہے عشق
دامن میں اشکِ خوں سے گلستاں لئے ہوئے

ہنستا ہے عشق غفلتِ اربابِ ہوش پر
دنیا ہے چند خوابِ پریشاں لئے ہوئے

میری نگاہِ شوق کو یہ کس نے بخش دیں
حیرانیاں لطافتِ عرفاں لئے ہوئے

گیسو بدوش وہ نظر آئے ہیں خواب میں
بیٹھا ہوں اک سکونِ پریشاں لئے ہوئے

اُن کو اُدھر حجاب، اِدھر اضطرابِ عشق
شوقِ تجلیاتِ فراواں لئے ہوئے

اختر پسندِ طبع خریدار ہو تو ہے
جاتا ہوں میں متاعِ دل و جاں لئے ہوئے

(۱۰۵)

آشنا دل سے گر انساں ہو جائے — ہمہ تن دیدۂ حیراں ہو جائے
اپنی ہستی کا جو عرفاں ہو جائے — کفر سر چشمۂ ایماں ہو جائے
وہ تبسم جو نمایاں ہو جائے — میکدہ عالمِ امکاں ہو جائے
میری جانب ہیں نگاہیں اُن کی — مطربِ روح غزل خواں ہو جائے
تم جو چاہو تو بہ یک جنبشِ لب — خسِ ناچیز گلستاں ہو جائے
برسرِ لطف ہو گر اُن کی نگاہ — خطِ پیمانہ رگِ جاں ہو جائے
عام ہو جائے اگر لذّتِ غم — ذرۂ خاک بیاباں ہو جائے
اس طرح مست نگاہوں کو اُٹھا — زہد غرقِ مئے عصیاں ہو جائے

موت کو ڈھونڈھ رہا ہوں اختر
کاش یہ مرحلہ آساں ہو جائے

غمِ نہاں ہے عشرتوں کا اک جہاں لئے ہوئے
اسیر ہوں مگر قفس میں آشیاں لئے ہوئے

جہاں کو سوزِ عشق نے نہ جانے کیا بنا دیا
کہ ایک مشتِ خاک ہے اب آندھیاں لئے ہوئے

دیارِ عقل و ہوش سے مقامِ سوز و ساز تک
پھری ہے تیری جستجو کہاں کہاں لئے ہوئے

نقابِ آرزو اُلٹ حجابِ مدعا اُٹھا
تری نظر ہے حُسن کا خود اک جہاں لئے ہوئے

تجلیٔ حیات ہے ہنوز بطنِ خاک میں
پھرا ہوں دل کو کارواں بہ کارواں لئے ہوئے

اک انقلاب آئے گا جہانِ سوز و ساز میں
وہ آ رہے ہیں ہر نظر میں بجلیاں لئے ہوئے

ازل سے ہے رہینِ غم سحر شبِ حیات کی
کہ غم ہے یادِ یار کی تجلیاں لئے ہوئے

نہاں ہیں میری خاک میں گدازِ دل کی رفعتیں
ٹھہر گیا ہوں میں زمیں پہ آسماں لئے ہوئے

(۱۰۷)

کوئی کہاں تک سہے جفائیں یہ بارِ غم کس طرح اٹھالے
دکھے ہوئے دل کی التجا سن بجھی ہوئی روح کی دعا لے
میں اس کی گہری نظر کے قرباں جو وہم ہستی پہ مسکرا دے
میں اس کے عرفانِ غم کے صدقے جو ہر نفس لذّتِ فنا لے
حیات آئینِ بے خودی ہے اسیرِ دامِ خرد نہ ہونا
کہ ہے تمنّائے ہوشیاری تو روح کو خواب سے جگا لے
نہ چھیڑ مطرب ترانۂ غم کہ ہے۔ ابھی تک تو رات باقی
ابھی سے اندیشۂ سحر کیا سحر کا تارا تو مسکرا لے
یہ جاں گزا رنجِ نامرادی کوئی کہاں تک اٹھائے اختر
میں اب تو یہ چاہتا ہوں دنیا سے مجھ کو میرا خدا اٹھا لے

(۱۰۸)

شوقِ رسوا کے لئے، داغ نمایاں کے لئے
عشق کی ہر سانس ہے اک تازہ طوفاں کے لئے

راحتیں لاؤں کہاں سے مضطرب جاں کے لئے
میں بنا ہوں تلخئ رنجِ فراواں کے لئے

کر رہا ہوں دل میں تخلیقِ جہانِ سوز و ساز
اہتمام اتنا تو ہو اب یادِ جاناں کے لئے

میں تری قرباں ہجومِ یاس کیا کہنا ترا
یہ سکوں اور دل کے اجزائے پریشاں کے لئے!!

میری قسمت میں خدا جانے کہاں سے آ گئے
وہ جو خم ہیں آپ کی زلفِ پریشاں کے لئے

ہر قدم دیتی ہے دنیا دعوتِ عرفانِ راز
ذرّہ ذرّہ اک جہاں ہے فکرِ انساں کے لئے

زندگی کیا ہے بتا اے دانشِ گم کردہ راہ
درسِ بیداری اور اس خوابِ پریشاں کے لئے

میری ہر آنسو میں گرمِ رقص ہے طوفانِ شوق
میں بنا ہوں اک نئی تعمیرِ دوراں کے لئے

ظلمتِ ہستی میں ہے اخترؔ بہ ربِّ کائنات
سینۂ شاعر چراغِ علم و عرفاں کے لئے

۱۰۹

بے خودی اعتبار کیا جانے — پردہ داریِ بہار کیا جانے
اے کہ تیرا تبسمِ رنگیں — شاہدِ نو بہار کیا جانے
اے کہ تیری لطافتِ آواز — مطربِ سحر کار کیا جانے
اے کہ تیری ادائے نرگسِ ناز — ساحرِ روزگار کیا جانے
عشرتِ نو بنو مبارک ہو — تو مرا حالِ زار کیا جانے

عشرتِ منزلِ سکوں اختر
اک غریب الدیار کیا جانے

۱۱۰

جب غم ہی زندگی ہے تو غم کیا اٹھائیے — جاتی ہے رات ساغر و مینا اٹھائیے
لائی ہے بادِ صبح پیامِ وداعِ ہوش — اب تو نقابِ چہرۂ زیبا اٹھائیے
کچھ کم نہیں ہے کشمکشِ دوش بھی ندیم — پھر کیوں سوالِ شورشِ فردا اٹھائیے
خالی نہیں جنونِ محبت سے روزگار — کیا فرض ہے کہ تہمتِ دنیا اٹھائیے
محرومیاں بساطِ زمانہ الٹ نہ دیں — اب لطف ہے اسی میں کہ پردا اٹھائیے
جاتی ہوئی بہار کی ہر سانس ہے عزیز — جب تک بنے نہ ساغر و مینا اٹھائیے

اختر شریکِ محفلِ رنداں ہوئے ہیں آپ
اب یہ بساطِ حسرتِ دنیا اٹھائیے

۱۱۱

مجھے کیوں باور آئے زندگی کا نقش فانی ہے
کہ اختر میں رہینِ غم ہوں اور غم جاودانی ہے

ٹپک پڑتے ہیں آنسو جب کسی کا درد سنتا ہوں
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ میری کہانی ہے

فریبِ زندگی کو دی گئی ہیں صورتیں کیا کیا
مجھے حرماں نصیبی پر یقینِ شادمانی ہے

کہیں دُور اک صدا سی آ رہی ہو جیسے نغموں کی
مری غمگیں جوانی کیا ہے اک خوابِ جوانی ہے

خدایا اُن کے آگے شرم رہ جائے محبت کی
حدیثِ آرزو ہے اور میری بے زبانی ہے

مری محرومئی صبر آزما اب کچھ سہی لیکن
مرے غمخوار! یہ عہدِ تمنا کی نشانی ہے

حیات و موت سب کچھ منحصر ہے اُنکی نظروں پر
نہ آئینِ فنا میرا نہ میری زندگانی ہے

محبت جاوداں ہستی سراپا وہم کیا کہیئے
خدا جانے یہ دنیا جاودانی ہے کہ فانی ہے

کشاکش میں ہوں اختر نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں
نہ جانے مجھ سے کیوں برہم مزاجِ زندگانی ہے

(۱۱۲)

جب نہ ہوا کوئی کفیل موت کفیل ہو گئی | میری حیاتِ مختصر، مرگِ طویل ہو گئی
غم نے کچھ اس طرح کیا رازِ جہاں کو بے نقاب | میری نظر میں زندگی اور ذلیل ہو گئی
آپ نے مسکرا کے یوں نظمِ جہاں بدل دیا | آج حدیثِ درد بھی ذکرِ جمیل ہو گئی
شکر ہے آنسوؤں نہیں اب خونِ جگر ہی گرمِ رقص | آپ سے عرضِ شوق کی کچھ تو سبیل ہو گئی

ذکرِ مآل چھیڑ کر تو نے غضب کیا ندیم!
ساعتِ عیش تھی ہی کیا اور قلیل ہو گئی

(۱۱۳)

وجودِ نغمہ ہو مگر حقیقتِ فغاں بھی ہے | بہ ہوش باش ای جواں! کہ پیر آسماں بھی ہے،
گدائے مئے سے مستعار زندگی کا ہوش لے | حیاتِ اہلِ ہوش ہے وہ خواب جو گراں بھی ہے،
کہاں سے لائے تابِ ضبط ابھی سے مرغِ نو اسیر | ابھی غمِ قفس بھی ہے، خیالِ آشیاں بھی ہے
فریبِ وہم ہی سہی مگر محیطِ عشق میں | حیاتِ مستعار کی یہ موجِ ناتواں بھی ہے
رہینِ دردِ عشق ہے حیات ہو کہ موت ہو | یہ جنسِ کائنات میں حقیر بھی ہے گراں بھی ہے،
وہ جل رہی ہو کہ روح میں خلش مجھے تو چاہیے | حقیقتِ حیات ہے، مرے لئے جہاں بھی ہے،

مغالطے ہیں کفر و دیں کہاں ہے اخترِ حزیں
جو رازِ کائنات ہے یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے،

(۱۱۴)

فروغِ مئے سے ہر موجِ نگہ حسن آفریں ہوتی
وہ ہوتے اور مرے قدموں پہ گردوں کی جبیں ہوتی

تری تقدیر! دنیا سو رہی ہے صبر کر اے دل
نہیں عقل اور آئینِ جنوں کی نکتہ چیں ہوتی

خوشا احساسِ غمِ دنیا نے پی ہیں کیوں ٹھیک کیا
مجھے راحت نہیں ملتی مجھے تسکیں نہیں ہوتی

اگر رازِ جنوں کو سطح بیں دنیا سمجھ سکتی
مری آشفتگی سرنامۂ علم و یقیں ہوتی

بہت اچھا تھا ننگِ منتِ دوراں سے یہ اختر
نہ کوئی بخیہ گر ہوتا نہ جیب و آستیں ہوتی

(۱۱۵)

شرحِ اسرارِ نہاں شوق کا افسانہ بنے
عشق دیوانہ ہے اب حسن بھی دیوانہ بنے

اس قدر کفرِ محبت میں فنا ہو جاؤں
آنکھ جس در سے اٹھائے صنم خانہ بنے

آج بھی وا ہے درِ میکدۂ عشق مگر
ہے کوئی رند جو کونین سے بیگانہ بنے

آ تو جائے لبِ خاموش پہ تھمتی ہوئی آہ
وہ سنیں یا نہ سنیں بات بنے یا نہ بنے

جلوہ بے قیدِ مکاں اور تماشا محدود
مستیٔ عشق، حریفِ غمِ دنیا نہ بنے

منزلِ دیدۂ بینا ہے حقیقت نہ مجاز
کعبہ بن جائے ترا دل کہ صنم خانہ بنے

ہے ترے غیب سے یہ فرقِ مراتب ورنہ
پردہ اٹھ جائے تو خود شمع بھی پروانہ بنے

عشق پھر برسرِ تعمیرِ جہاں ہے اختر
کیا عجب ہے کہ حقیقت بھی اب افسانہ بنے

(۱۱۶)

اگر آگاہِ مستی فطرت مجبور ہو جائے
بقدرِ لفظ و معنی ذرّہ ذرّہ طور ہو جائے

انھیں اے کاش اک سیرِ دگر منظور ہو جائے
تماشا بے نیازِ قید و بندِ طور ہو جائے

تمھارے زخمیوں کا پوچھنا کیا یہ اگر چاہیں
تو اِن کے خون کا ہر قطرہ اک منصور ہو جائے

خدا شاہد، جوابِ ناشناسی بن نہیں پڑتا
پھر اک ہلکی سی جنبش جلوۂ مستور ہو جائے

یہ پیہم نامرادی، مجھ پر ان کا التفات ایسا!!
مری ہستی کہیں ایسا نہ ہو مغرور ہو جائے

مجھے خود کب گوارا ہے تمھارا بے حجاب آنا
خدا ناکردہ! کیوں میری نظر مجبور ہو جائے

محبّت میں اسی کا نام مرگِ نامرادی ہے
ترے عرفاں سے گر عقلِ غلط بیں دور ہو جائے

غمِ پنہاں کے چہرے سے اُٹھا دوں گر نقاب اخترؔ
یہ اشک و آہ کی دنیا سراپا نور ہو جائے

(۱۱۷)

تلاشِ ناتمامِ شوق ہے نا آشنا دل سے
میں جتنا متصل ہوں دور ہوں اتنا ہی منزل سے

ہوس محروم رکھتی ہے مجھے عرفانِ منزل سے
میں ہوں وہ موج جو ٹکرا کے رہ جاتی ہے ساحل سے

امیدیں ہنس رہی تھیں میں جب آیا اُن کی محفل میں
امیدیں رو رہی تھیں میں جب اٹھا اُنکی محفل سے

کہاں کی عقل، کیسا ہوش، یہ اجزائے ہستی کیا
بنائے زندگی پائندہ تر ہے عشقِ کامل سے

مجاز آئینہ ہے دراصل اسرارِ حقیقت کا
ہوائے رہگزر پردے اُٹھا دیتی ہے محمل سے

حریفِ جادۂ دشوار بن اور مسکراتا جا
کہ مشکل اصل میں بنتی ہے صرف احساسِ مشکل سے

غمِ بے حاصلی کیا جل گیا خرمن اگر اختر
یہ حاصل ہے کہ ہوں میں بے نیازِ امیدِ حاصل سے

وہی جنوں ہے وہی اہتمامِ جامہ دری
جگر کے زخم ہیں نا آشنائے چارہ گری
حیات و ذوقِ طرب!! اے رہینِ بے خبری!
گئی نہ ظلمتِ شب تا ستارۂ سحری
غمِ زمانہ صبر آزما مبارکباد
کہ رازِ ہمتِ پرواز ہے شکستہ پری
ہر ایک ذرۂ تاریک ہے حریمِ جمال
حجابِ دید اگر ہو نہ تیری کم نظری
مقامِ شکر ہے اے شکوہ سنجِ ناپرسی
کہ ننگِ زخمِ جگر تھا خیالِ بخیہ گری
حدودِ میکدہ ہیں کائناتِ لامحدود
جہانِ بیخودی و صد جہانِ بیخبری
مرے حریمِ تمنّا میں شب کی آمد ہے
چمک رہا ہے فلک پر ستارۂ سحری
ذلیل کیوں نہ متاعِ کمال ہو اختؔر
ہوئی ہے زینتِ بازار جنسِ بے ہنری

(۱۱۹)

کیا لطافتِ غم کو نہ رائگاں میں نے
لبوں کو دی نہ کبھی رخصتِ فغاں میں نے

غمِ فنا سے لیا عیشِ جاوداں میں نے
متاعِ عشق کو اتنا کیا گراں میں نے

بنا دیا جو محبت کا راز داں میں نے
زمیں کو بخش دیا اوجِ آسماں میں نے

نصیبِ دل ہیں ازل سے تصوراتِ جمال
فضائے برق میں رکھا ہے آشیاں میں نے

بہت لطیف تھی رودادِ عاشقی لیکن
زبانِ حال سے کہہ دی یہ داستاں میں نے

مری بلا کو ہو جاتی ہے بہارِ غم
بہت لٹائی ہیں ایسی جوانیاں میں نے

اجل کا راز بس اتنا ہے کچھ دنوں کے لئے
بجھا کے رکھ دی ہے شمعِ غمِ نہاں میں نے

بقدرِ شوق نہ تھا اہتمامِ سوز و گداز
ضمیرِ خاک میں بھر دی ہیں بجلیاں میں نے

بساطِ ہوش سے تا جلوہ گاہِ مستیٔ و کیف
تجھے تلاش کیا ہے کہاں کہاں میں نے

ملا کہیں نہ دلِ آشنائے دردِ اختر
یہ جنس دہر میں پائی بہت گراں میں نے

(۱۲۰)

کر چکا اب گلۂ کاوشِ پنہاں کوئی
درد کی آڑ میں ہو سلسلہ جنباں کوئی

اس تکلف سے نہ دی دعوتِ عرفاں کوئی
ذرہ ذرہ ہو کہ ہے جلوۂ عریاں کوئی

ایک نقطہ پہ سمٹ آئیں نہ اجزائے حیات
جنبشِ تازہ پھرائے شوقِ پریشاں کوئی

دل میں رقصاں ہو وہی پرتوِ اوہام ہنوز
یوں بھی ہوتا ہے غمِ عشق کا عرفاں کوئی

لے اڑا لالہ و گل کو بھی خمِ زلفِ بہار
اب گریباں ہی سلامت ہے نہ داماں کوئی

بے طلب آ کے رہو اور جو مانگو تو نہ آئے
زندگانی پہ نہیں موت کا احساں کوئی

جان کیوں تن سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہو
عیشِ سرمد تو نہیں عمرِ گریزاں کوئی

الاماں سوزِ محبت کہ یہ عالم کب تک!
جیسے ہو دل میں نہاں شعلۂ لرزاں کوئی

اشک امڈے ہوئے آنکھوں میں لبوں پر آہیں
پھر مری روح میں بیدار ہے طوفاں کوئی

لاکھ لبریزِ مئے رنگ کو مینائے بہار
دل میں بجھتا ہو شرارِ غمِ پنہاں کوئی

میں رہا صرفِ شبِ وادیٔ وحشت اختر
میرے عالم میں نہ تھی صبحِ گلستاں کوئی

(۱۲۱)

روحِ آزادی پر اک بندِ گراں دیکھا کئے
ہم قفس میں پھر بھی خوابِ آشیاں دیکھا کئے

اور ہم سے بیکسوں کا کون ہوتا غمگسار
آپ ہی ہم اپنے مٹنے کا سماں دیکھا کئے

اک جہانِ گفتگو تھا وہ سکوتِ منفعل
شکوہ کیا کرتے یہ اندازِ بیاں دیکھا کئے

ان کی نظریں بے محابا ان کے جلوے بے حجاب
کیا بتائیں، ہم خدا جانے کہاں دیکھا کئے

دیکھ کر مجھ کو وہ سمجھے رازِ پنہاں کچھ ضرور
غور سے رنگِ نگاہِ راز داں دیکھا کئے

کس گھڑی رکھی تھی کیا جانے بنائے آشیاں
روز اک بجلی حریفِ آشیاں دیکھا کئے

دیدہ و دل کر دئے اخترؔ جنھوں نے نذرِ عشق
ذرّے ذرّے میں جہاں اندر جہاں دیکھا کئے

(۱۲۲)

میرے قدموں پر جبیں رہتی ہے صبح و شام کی
میں نے پہچانی ہیں نبضیں گردشِ ایّام کی

ترک کیجے وہمِ ہستی اور فنا ہو جائیے
اس کشاکش میں یہی صورت ہے اک آرام کی

مطرب خوش گل تری رنگیں نوائی کے نثار
ساز کیا چھیڑا کہ بارش ہو گئی الہام کی

آنکھ ساقی نے اُٹھائی تھی زہے فیضانِ عشق
گر گئی تعمیر احساسِ غمِ ایّام کی

ہاں پھر اک جنبش تڑپ کر، اے اسیرِ بندِ غم!
چند کڑیاں اور باقی رہ گئی ہیں دام کی

اوّل اوّل تا بہ حدِ ظرف ملتی ہے شراب
یہ بھی گویا رسم جاری ہے دیارِ جام کی

غم، بقدرِ ظرف، الٹ دیتا ہے ہستی کی بساط
عشق کا آغاز بھی اک شکل ہے انجام کی

(۱۲۳)

شبوں کو رشکِ سحر بنا دے سحر کے غنچے گلاب کر دے
جو شمع سینے میں کی ہی روشن اب آ، اسے آفتاب کر دے

پھر اس تکلف سے دیکھ مجھ کو کہ زندگی کی بساط اُلٹ دے
سکوت، ہنگامہ آفریں کر سکوں کو اب اضطراب کر دے

ادا کی سحر آفرینیوں کو ستم کی آزادیاں عطا کر
نظر کی صہبا فروشیوں سے دلوں کی دنیا خراب کر دے

فریبِ تابِ نگاہ کب تک امر گلستاں کو جاوداں کر
جلا کے میری نظر کے پردے حقیقتیں بے نقاب کر دے

وہ لذتِ بے خودی عطا کر، فدا ہو پندارِ عقل جس پر
بنے جو بیداریوں کا عنواں مراد وہ آئینِ خواب کر دے

دھوئیں کو صبحِ الم کے چمکا لطیف جلووں کی روشنی میں
وہ شب جو "بے کیف تیرگی" ہے اسے شبِ ماہتاب کر دے

شراب کی بو سے ہر نفس ہو نسیمِ صبحِ مراد میرا
مرے شبستانِ غم کو آ اب بہشتِ حسن و شباب کر دے

وہ بادۂ لالہ رنگ ساقی جو شب کو رشکِ سحر بنا دے
وہ نغمۂ دلپذیر مطرب جو زہرِ غم کو شراب کر دے

(۱۲۴)

وہ ستم کش ہوں کہ عنقا ہے خوشی میرے لئے
میں برائے بیکسی ہوں بیکسی میرے لئے

اس قدر نا آشنائے شادمانی ہوں ندیم
اب گراں ہے زخمِ باطن کی ہنسی میرے لئے

ہر قدم بیچارگی سے آنکھ ہوتی ہے دوچار
زندگی ہے ایک شرحِ نارسی میرے لئے

بجھ گیا ہے دل کچھ ایسا گردشِ ایام سے
تشنہ کامی بن گئی ہے سرخوشی میرے لئے

کس سے پوچھوں رازِ ہستی کون ہے آئیں شناس
یہ جہاں ہے عرصۂ نامحرمی میرے لئے

جستجو ہے بیکارِ عالم کچھ نہیں جز مشتِ خاک
عقل ہے گم کردۂ ناآگہی میرے لئے

اس قدر اخترؔ اٹھائی ہے جفائے روزگار
موت سے بدتر ہے میری زندگی میرے لئے

(۱۲۵)

وسعتِ ہستی و عدم گوشۂ دل میں بند ہے
عشق کی منزلِ حیات عرش سے بھی بلند ہے

اہلِ نظر سے پوچھئے مطلبِ گریۂ فراق
آہ نہیں پیام ہے اشک نہیں کمند ہے

جور پہ جور کیجئے حشر پہ حشر اٹھائیے
میں بھی فدائے ناز ہوں دل بھی نیازمند ہے

دردِ فراق کے عوض عیشِ وصال کی طلب
تجھ کو پسند ہو تو ہو مجھ کو تو ناپسند ہے

کچھ تو خیال چاہیے پرسشِ حال چاہیے
بندۂ آستاں ترا اخترؔ دردمند ہے

(۱۲۶)

تجھے کیا بتاؤں کہ دل میں کیوں طلبِ جراحتِ یاس ہے،
یہ حدیثِ لذتِ عشق ہے کہ بروںِ فہم و قیاس ہے

مجھے تو پیامِ کرم نہ دے ابھی اعترافِ ستم نہ کر
مرے دل میں کچھ تو ہے خوں ابھی، کہ زباں رہین سپاس ہے،

غمِ دل سے درسِ حیات لے، کہ ہے بے خبر تری منتظر
وہ بہشتِ عشرتِ سرمدی جو اسی مقام کے پاس ہے

نہ سہی مئے طرب آفریں، مرا جامِ شوق تہی سہی
مجھے زندگی سے گلہ نہیں کہ ابھی تو مرنے کی آس ہے

تجھے کیا بتاؤں کہ بیخودی میں نہاں ہیں کتنی فراغتیں
تو فریب خوردۂ ہوش ہے تو اسیرِ وہم و قیاس ہے

ترے لطف نے تو کمی نہ کی یہ مرا نصیب بایں ہمہ
وہی اضطرابِ خیال ہے، وہی اختلالِ حواس ہے

مجھے دی ہے طاقتِ دید اگر تو یہ اہتمامِ حجاب کیا
میں نظر کو کیسے فریب دوں کہ یہ تیری جلوہ شناس ہے

مجھے آہ اخترؔ بینوا غمِ دہر سے وہ سبق ملا
کہ نہ عشرتوں کی تلاش اب نہ ملالِ حسرت و یاس ہے،

(۱۲۷)

عشرتِ مئے ہی تلخئ رنجِ خمار کے لئے — کس کی نگاہ لائیے سیرِ بہار کے لئے

جلوۂ مختلف سے ہی زینتِ بزمِ آب و گل — طرزِ حیات ایک ہے غنچہ و خار کے لئے

دل ہی نہیں اگر نہ ہو صرفِ لطافتِ جمال — صحنِ چمن ہے مستئ بادِ بہار کے لئے

چین ہوا کسے نصیب گردشِ روزگار میں — رہ گذرِ حیات ہے رقصِ غبار کے لئے

حسنِ فریبِ آرزو اخترؔ زار دیکھنا
ڈھونڈھ رہا ہوں میں سکوں قلبِ فگار کے لئے

(۱۲۸)

حدیثِ دردِ محبت سنائی جاتی ہے — مگر وہ ہیں کہ اُنھیں نیند آئی جاتی ہے

امید سے خلشِ دل بڑھائی جاتی ہے — ہنوز طاقتِ صبر آزمائی جاتی ہے

وہ اور نیچی نگاہوں سے اعترافِ ستم! — غرض یہ ہے کہ قیامت اُٹھائی جاتی ہے

مری نگاہ سے چھپ کر خوشا رعایتِ ذوق — مری نگاہ پہ بجلی گرائی جاتی ہے

ہنوز وہ ہیں اور آرائشِ خمِ گیسو — دلوں میں درد کی دُنیا بسائی جاتی ہے

یہ بات کیا ہے کہ سن کر نویدِ فصلِ بہار — مری نگاہ پہ حسرت سی چھائی جاتی ہے

مشاہداتِ حقیقت کو ہے بہت اخترؔ
وہ اک کلی جو چمن میں کھلائی جاتی ہے

(۱۲۹)

فریبِ جلوہ کہاں تک بروئے کار رہے
نقاب اُٹھاؤ کہ کچھ دن ذرا بہار رہے
خرابِ شوق رہے، وقفِ انتظار رہے
اب اور کیا ترے وعدوں کا اعتبار رہے
میں رازِ عشق کو رسوا کروں، معاذ اللہ!
یہ بات اور ہے دل پہ نہ اختیار رہے
پھر اہلِ شوق ہیں سرگرمِ اہتمامِ نظر
وہ رقصِ برقِ تجلی پھر ایک بار رہے
سکونِ عشرتِ کونین اُس کا حصّہ ہے
وہ دل جو تیری تصور میں بے قرار رہے
چمن میں رکھ تو رہا ہوں بِنا نشیمن کی
خدا کرے کہ زمانہ بھی سازگار رہے
جنوں کا رُخ ہے حریمِ حیات کی جانب
الٰہی پردۂ اوہامِ اعتبار رہے
جہاں میں قدرِ سکوں اس سے پوچھیے اختؔر
وہ غم نصیب جو اک عمر بے قرار رہے

(۱۳۰)

بیخودی معنیٔ عرفاں نظر آتی ہے مجھے — صورتِ جلوۂ پنہاں نظر آتی ہے مجھے
میں تری حیرتِ معصوم کے صدقے یہ نہ پوچھ — موت کیوں درد کا درماں نظر آتی ہے مجھے
عشق نے کی ہے عطا وہ نگہہ جلوہ شناس — جنبشِ نبضِ گلستاں نظر آتی ہے مجھے
عالمِ شوق میں کچھ اور ہیں آدابِ حیات — کفر میں صورتِ ایماں نظر آتی ہے مجھے
زندگی پرتوِ اوہام ہے، ہے بھی کہ نہیں — اک کفِ خاک، پریشاں نظر آتی ہے مجھے
میرے گلشن میں نہ آئے گی بہار اب شاید — جمع کچھ خاطرِ داماں نظر آتی ہے مجھے
یہ شبِ ماہ، یہ موسم، یہ ہوائیں، یہ بہار — ہر کلی آج غزل خواں نظر آتی ہے مجھے
مستیٔ شوق کے قرباں کہ اب اُن کی صورت — اپنی صورت میں نمایاں نظر آتی ہے مجھے
لے مبارک ہو تجھے اے نفسِ صبحِ بہار — موجِ خوں اک سرِ مژگاں نظر آتی ہے مجھے
چونک پڑتا ہوں جب انجام کا آتا ہے خیال — زندگی خوابِ پریشاں نظر آتی ہے مجھے

کوئی منزل ہے نہ راہوں کا ٹھکانا اخترؔ
ایک دُنیا ہے کہ حیراں نظر آتی ہے مجھے

(۱۳۱)

خزاں آلودہ، صبحِ گلستاں معلوم ہوتی ہے
یہاں بھی یاس جزوِ داستاں معلوم ہوتی ہے

حجابِ حُسن ہے جب آپ حُسنِ بے حجاب اُن کا
تو اب تابِ نظر بھی رائگاں معلوم ہوتی ہے

مری دانست میں خوابِ گراں ہے رازِ بیداری
کہ بیداری مجھے خوابِ گراں معلوم ہوتی ہے

یہ میدانوں کی وحشت، راستوں کے پیچ و خم ایسے
یہیں سے سرنوشتِ کارواں معلوم ہوتی ہے

قفس میں کیوں چلی آتی ہے یادِ گلستاں ہمدم
کوئی بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کیے جاتے ہیں وہ بیداد لیکن اس تکلف سے
کہ ہر بیدادِ حُسنِ امتحاں معلوم ہوتی ہے

نہیں جاتا، نہیں جاتا، بلاؤں کا ہجوم اخترؔ
حیاتِ غم، حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

(۱۳۲)

غرقِ طوفاں ہوں مگر اب بھی یہ عالم دل کا ہے
ہر نفس، ہر موجِ سرکش، پر یقیں ساحل کا ہے
اب مجھے احساس اپنی سعئ بے حاصل کا ہے
یعنی ساحل نام ہی ترکِ غمِ ساحل کا ہے
نارسائی پر یقیں، آسایشِ منزل کا ہے
دہر اک ٹکڑا کسی افسانۂ باطل کا ہے
میں کہ تھا اک رازِ فطرت، خود ہوں سرگرمِ تلاش
کچھ ٹھکانا وسعتِ اندیشۂ باطل کا ہے
اب کھُلا کیوں دہر میں، اُلجھا دلِ حسرت پرست
اس میں کچھ انداز تیرے عشوۂ قاتل کا ہے
بجلیاں مدت ہوئی، چمکیں، گریں، لیکن مجھے
خرمنِ برباد پر اب بھی یقیں حاصل کا ہے
رہ گئے پیچھے تو کیا غم، دو قدم کی بات ہے
گردِ راہِ کارواں یہ، وہ نشاں منزل کا ہے
ہر نفس پاتا ہوں اختر بے قراری کا پیام
میری ہر جنبش اک افسانہ دلِ بسمل کا ہے

(۱۲۳)

اُس دشمنِ دین و آئیں کی بیداد کا عالم کیا کہیے
شیرازۂ ہستی کس نے کیا ہے درہم و برہم کیا کہیے
خوں گشتہ جگر کو روتی ہے تقدیر مری محرومی کی
ہر سانس ہے کیوں لبریزِ فغاں، کس کا ہے یہ ماتم کیا کہیے
بکھرے ہوئے اجزا اور وہ بھی پامالِ رہِ طوفانِ ہوا
مشتاقِ سکوں ہے ہستی کا شیرازۂ برہم کیا کہیے
بھر دی ہے جو تم نے سینے میں کیا جانے خلش ہے یا کہ نہیں
رکھا ہے جو تم نے زخموں پر نشتر ہے کہ مرہم کیا کہیے
کیا حال بتائیں اختؔر کا تم آپ ہی جا کر دیکھ نہ لو
دیوانہ تو پھر دیوانہ ہے، دیوانے کا عالم کیا کہیے

(۱۳۴)

دور نہیں ہیں عشرتیں، سرحدِ اشک و آہ سے
رازِ نشاط پوچھیے میرے دلِ تباہ سے

دل میں ہجومِ اضطراب، سجدے جبیں میں بے قرار
عشق کی پھر طلب ہوئی، حُسن کی جلوہ گاہ سے

عشق کی دردمندیاں، رازِ سکوں بتا گئیں
درسِ یقیں ملا مجھے مکتبِ اشتباہ سے

میری جبیں پہ مسکرائے، تیری لطافتِ جمال
تجھ کو قسم ہے حُسنِ دوست، دیکھ اب اس نگاہ سے

چند نفس کیں طے ہوئے شوق کے سارے مرحلے
دور نہ تھا حریمِ دوست منزلِ غم کی راہ سے

یونہی سا اضطرابِ دل دونوں جہاں پہ چھا گیا
ارض و سما اُلٹ گئے تھمتی ہوئی اک آہ سے

دردِ نہاں بقدرِ شوق دیجئے یا نہ دیجئے
شکوہ ہے مجھ کو آپ کی پرسشِ گاہ گاہ سے

یادِ ماضی

دلِ دردمندِ وفا چاہتا ہوں
محبت کی شیریں جفا چاہتا ہوں

وہ گزرا ہوا عہدِ شوقِ فراواں
پھر اُس عہد کی ابتداء چاہتا ہوں

سکونِ مسلسل سے گھبرا گیا ہوں
وہی دردِ صبر آزما چاہتا ہوں

مجھے لذّتِ زندگی جس نے بخشی
وہی تلخ جامِ فنا چاہتا ہوں

سنہری تھیں جس سے محبت کی راتیں
وہی بادۂ جانفزا چاہتا ہوں

وہی جلوۂ ماہتاب ولبِ جو
وہی شامِ کیف آشنا چاہتا ہوں

وہی جامِ صہبا، وہی دستِ سیمیں
وہی صبحِ دانش ربا چاہتا ہوں

وہی ابرِ سرخوش، وہی عہدِ مستی
وہی روح پرور فضا چاہتا ہوں

مری ہر رگِ دل کو تڑپانے والی
وہی شوخ طرزِ حیا چاہتا ہوں

مجھے دولتِ شوق جس نے عطا کی
وہی غمزۂ دل ربا چاہتا ہوں

ہوئی جس سے تکمیل درسِ محبت
وہی ناز پرور ادا چاہتا ہوں

غمِ دل کو جس نے کیا عیشِ سرمد
وہی کاوشِ دل کشا چاہتا ہوں

وہی بے حجابانہ شکرِ محبت
وہی شکوۂ برملا چاہتا ہوں

جو ہر کامیابی سے بیگانہ کردے
وہ محرومئ مدعا چاہتا ہوں

وہی زہد دشمن، پرستارِ صہبا — وہی پھر دلِ بے ریا چاہتا ہوں
شراب و نشاط و نگار و ترنم — وہی رحمتیں اے خدا چاہتا ہوں
اگر ہو خریدار کوئی تو آئے — کہ میں دین و دل بیچنا چاہتا ہوں

کہیں عہدِ ماضی پلٹتا ہے اختر
میں دیوانہ ہوں، ہائے کیا چاہتا ہوں

"وہ"

پھر انجمنِ ناز کے پردوں میں ہے جنبش — نظّارے کی ہو چشمِ تمنّا کو بشارت
پھر ذرۂ خاموش ہے معمورِ تبسم — پھر غنچۂ شاداب ہے سرشارِ مسرت
سازِ طرب آہنگ ہے اور شامِ تمنّا — جامِ مئے گلرنگ ہے اور صبحِ لطافت
پھر عشق ہے قندیلِ رہِ منزلِ اسرار — پھر عقل ہے گرمِ سفرِ وادئ حیرت
پھر حسن نے کی رسمِ کہن دہر میں تازہ — یک جرعۂ صہبا و صد اسرارِ حقیقت
پھر جلوہ سرشار ہے اور منظرِ بینش — پھر نغمۂ بیدار ہے اور درسِ محبّت
نقشِ قدمِ حسن ہے اور سجدۂ بیتاب — طوفِ حرمِ ناز ہے اور جوشِ ارادت
پھر دہر میں ہے غلغلۂ قلقلِ مینا — گردوں سے ہے پھر سلسلۂ بارشِ رحمت
ساقی نے دیا بیعتِ آزاد کا پیغام — صہبائے کم و کیف ہے انعامِ عقیدت

ہاں صبح نے پھر کھول دیا، پرچمِ انوار
ہاں شام نے پھر ختم کیا دورہ ظلمت

پھر روح میں بیدار ہو کاہش کی تمنا
پھر قلب میں بیتاب ہو ارمانِ جراحت

پھر دل ہو اور اک روح فزا لذتِ آزار
پھر سر ہے اور اک صبر شکن شوقِ شہادت

پھر میں ہوں اور اک جذبہ تکمیلِ پرستش
پھر وہ ہو اور اک جلوہ شایانِ عبادت

اللہ کرے یونہی رہے حشر تک اختر
یہ ہوش رُبا دورِ مئے ناب یہ صحبت

"تم"

کیوں مجھ سے اب نگاہ ملاتے نہیں ہو تم
خوابیدہ بجلیوں کو جگاتے نہیں ہو تم

پہلے بھی تھا حجاب کا آئیں بروئے کار
اب کیوں نقاب رُخ سے اُٹھاتے نہیں ہو تم

اب بھی وہی ہیں لالہ و گل کی لطافتیں
گیسو بدوش کیوں مگر آتے نہیں ہو تم

کیا ہوگئی وہ عادتِ مشقِ خرامِ ناز
کیوں سازِ رنگ و بو کو جگاتے نہیں ہو تم

جس نے کیا تھا عقل و دل و دیں سے بے نیاز
کیوں پھر وہی شراب پلاتے نہیں ہو تم

جس بیخودی پہ دانشِ کونین تھی نثار
کیوں وہ متاعِ کیف لٹاتے نہیں ہو تم

جو دل کی دھڑکنوں کو دکھاتا تھا بے نقاب
وہ نغمہ چھیڑ چھیڑ کے گاتے نہیں ہو تم

کھولے تھے جس نے دیدۂ و دل پر سکوں کے راز
اب دل میں کیوں وہ آگ لگاتے نہیں ہو تم

زندہ تھا جس سے شیوۂ تعمیرِ آرزو
اب کیوں وہ برقِ ناز گراتے نہیں ہو تم

وہ آسمانِ عشق و جنوں، عرش سے بلند
اُس آسماں پہ اب نظر آتے نہیں ہو تم

وہ سرزمینِ شوق و تمنا حریفِ خلد
اس سرزمیں کو آ کے بساتے نہیں ہو تم

اختر کسی کی حالتِ دل کیسے جان لے
مشکل تو ہے یہی کہ بتاتے نہیں ہو تم

"میں"

جس کا شباب ہو ابدی وہ جواں ہوں میں / یعنی مُریدِ حضرتِ پیرِ مغاں ہوں میں
اک وہم ہے یہ قیدِ مکاں، لامکاں ہوں میں / اک خواب ہے یہ وہمِ فنا، جاوداں ہوں میں
اس درجہ ہے لطیف مرا عالمِ نشاط / رقصِ نسیم و لرزشِ موجِ رواں ہوں میں
میرا ہر اک نفس ہے حدیثِ جمالِ دوست / سوز و گدازِ عشق کی روحِ رواں ہوں میں
مجھ کو فریبِ جلوہ نہ دے، حُسنِ عشوہ ساز! / تو خوب جانتا ہے ترا رازداں ہوں میں
میرا مقامِ خواب نہیں یہ بساطِ خاک / یعنی سرودِ مجلسِ روحانیاں ہوں میں
جس پر متاعِ انجم و مہرِ مبیں نثار / اے ارضِ کائنات، وہ جنسِ گراں ہوں میں
رتبہ ہے وہ مرا کہ ملائک نہ پا سکے / اس انجمن میں موردِ قلبِ تپاں ہوں میں
اک مصلحت ہے، ہستیٔ فانی کا یہ حجاب / اس پر نہ جا کہ داورِ کون و مکاں ہوں میں
آئی تھی جستجو میں مری برقِ حادثات / خود مٹ گئی وہ مرغِ بلند آشیاں ہوں میں
ظاہر میں ہوں گرفتۂ دامِ حیات و موت / لیکن باینہمہ سببِ کُن فکاں ہوں میں
تھا جو ازل سے سینۂ فطرت میں بیقرار / سُن غور سے مجھے اسی دل کی زباں ہوں میں
حیرانِ اعتبار نہیں ہے مرا جنوں / آزادِ اضطرابِ یقین و گماں ہوں میں
اندازِ حُسن جلوہ بہ جلوہ عیاں سہی / لیکن ہنوز پردہ بہ پردہ نہاں ہوں میں

کرتا ہوں غور اپنی حقیقت پہ جس قدر
اکثر یہ سوچتا ہوں کہ اختر کہاں ہوں میں

نظمیں

ساقی

بہار آئی ہے پیہم بارشِ انوار ہے ساقی
اٹھا ساغر کہ سازِ رنگ و بو بیدار ہے ساقی

فروغِ مے سے خوابِ ہوش کو دے شانِ بیداری
کہ یہ دنیا ابھی نامحرمِ اسرار ہے ساقی

بہت لب تشنہ ہیں پست و بلندِ کائنات اب بھی
ابھی تک زندگی کی سطح ناہموار ہے ساقی

تجھے کیا خوف ہے آویزشِ پیرانِ خود بیں کا
کہ موجِ بادہ اک چلتی ہوئی تلوار ہے ساقی

الٹ دے جو بساطِ عرصۂ کون و مکاں آخر
ترے صدقے مجھے وہ بیخودی درکار ہے ساقی

وہ غنچے مسکرائے، وہ ہوا سنکی، وہ ابر اٹھا
خوشا! مستی کہ دنیا ہوش سے بیزار ہے ساقی

چمن میں آج شاید شبنم افشاں ہے نفس تیرا
کہ ہر نورس کلی اک ساغرِ سرشار ہے ساقی

بتایا مجھ کو یہ رازِ نہاں، عرفانِ مستی نے
کہ دنیا اک فریبِ فطرتِ بیدار ہے ساقی

ابھی آباد ہیں سینے محبّت کی تجلّی سے
ابھی ساغر میں تیرا پرتوِ رخسار ہے ساقی

نہیں بے لذّتِ عرفاں، یہ میری بادہ آشامی
سمجھتا ہوں کہ دنیا بے سبب آزار ہے ساقی

حجاب اتنا بھی کیوں رہ جائے، صدقہ چشمِ میگوں کا!
زبانیں چپ ہیں، روحوں میں ترا اقرار ہے ساقی

رگِ ہستی میں گرمِ رقص ہے خوں کے عوض بجلی
تری فیاضیوں سے اب کسے انکار ہے ساقی

اسے بھی بے خودی کی لذّتوں سے آشنا کر دے
ترا اختؔر خرابِ بادۂ پندار ہے ساقی!

تیرے بغیر

آ کہ ہے ڈوبی ہوئی نبضِ جہاں تیرے بغیر
میری بیداری ہے اک خوابِ گراں تیرے بغیر

ہائے وہ تیرے تبسم کا سرودِ جاں نواز
ہر نفس میں کانپتی ہیں بجلیاں تیرے بغیر

اب ہوا محسوس، تیری حُسنِ رنگیں کی قسم
ہر رگِ دل ہے کوئی زخمِ نہاں تیرے بغیر

کاش اے صیاد! میں رہتا قفس ہی میں اسیر
زہر ہے آب و ہوائے آشیاں تیرے بغیر

نرگسِ مئے گوں کے صدقے، کس قدر بے کیف ہیں
موجِ مئے کی دلنشیں انگڑائیاں تیرے بغیر

چاندنی کا رقص، موجِ گل، سرودِ جوئے آب
لے رہی ہیں دل میں کیا کیا چٹکیاں تیرے بغیر

توبہ توبہ مجھ پر تراشی جا رہی ہیں تہمتیں
کُو بہ کُو رسوا ہے میری داستاں تیرے بغیر

عشرتیں پیمانہ بر کف ہیں وہاں تیری لئے
حسرتیں محشر بہ داماں ہیں یہاں تیرے بغیر

نیم رس غنچے پریشاں، نیم وا کلیاں اداس
رہ گئی ہے بُجھ کے روحِ گلستاں تیرے بغیر

تو ہے آئینہ ہے اور آرائشِ زلفِ دراز
میں ہوں اور صبر آزما حیرانیاں تیرے بغیر

وہ فروغِ لالہ و گل کی تمنا اب کسے
وہ خیالِ بادہ و ساغر کہاں تیرے بغیر

اخترِ مہجور کی شیریں کلامی ہو چکی
نطق ہے بیگانۂ حسنِ بیاں تیرے بغیر

حسنِ سرِ راہ

ہوئی ہے آج یہ کس سے مری نگاہ دوچار — کہ خود بخود ہوئی جاتی ہے سلب طاقتِ ہوش

یہ کس کے مہرِ تجلی کی ہے شعاعِ لطیف — کیا ہے خاک کے ذروں کو جس نے آئینہ پوش

مچل رہی ہیں رگ و پے میں کیف کی موجیں — یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا سازِ خموش

ہجومِ رنگ سے ہے نبضِ کاہ میں حرکت — وفورِ حسن سے ہے موجِ خاک لالہ فروش

اٹھا رہا ہے کوئی بزمِ راز کے پردے — سرودِ موجِ صبا ہے کہ ہے نوائے سروش

ندیم! کس کو ملی ہے یہ نعمتِ سرمد — نگاہِ جلوہ شناس و نگارِ جلوہ فروش

گئی وہ تیرگیٔ شب، وہ رسمِ بیخبری — جبینِ دہر پہ چمکا ستارۂ سحری

نگاہ محرمِ اسرار ہو تو بزمِ حیات — نہیں کچھ اور بجز اک ادائے جلوۂ ناز

کھلا ہوا ہے ازل سے درِ حریمِ جمال — کوئی حجاب ہے صبر آزما نہ پردۂ راز

چھلک رہا ہے پیالوں میں رنگِ بادۂ ناب — لرز رہی ہے سرِ دوش موجِ زلفِ دراز

جدا ہے عقل کی سرحد سے بیخودی کا مقام — نہ پیچ و خم ہیں نہ اس راہ میں نشیب و فراز

وسعتِ ساغرِ دل چاہیے رہینِ طپش — وہ موجِ بادہ کہ ہو آتشِ پیالہ گداز

یہ مشتِ خاک اور اتنی بصیرت افروزی — مگر عمیق ہے کتنا فریبِ حسنِ مجاز!!

نہاں ہے بیخبری میں نشاطِ منزل بھی
شکستِ دل میں ہے تعمیرِ ہستیٔ دل بھی

مختصر نظمیں

(۱)

تو نے مئے پی، اور زمانے کی نظر سے گر گیا میری حق کیشی سے دنیا نے مری تعظیم کی
میں نے دیکھا اک پریشاں حال کو زار و نزار اور صبر و شکر کی خوبی اُسے تعلیم کی
جب مگر تیری نگاہوں سے یہ گزرا ماجرا بند تھیں گو تجھ پہ راہیں کوثر و تسنیم کی
تو نے تسکیں دی، سنوارے اس کے اوضاعِ حیات یعنی کچھ بکھرے ہوئے اوراق کی تنظیم کی
قدسیوں کو گیت تیری وصف میں گاتے ہوئے
میں نے دیکھا تیرے سر پہ پھول برساتے ہوئے

(۲)

وہ فلسفی تھا مسائل کچھ اس نے وضع کئے جہانِ عقل میں سمجھے گئے اصولِ حیات
اسی کے ساتھ اک آشفتہ حال شاعر نے سُنائے چند ترانے مصوّرِ جذبات
مسافروں نے سرِ رہگزر جنھیں گایا کہ تلخ و صبر شکن ہوں شہ راہ کے صدمات
جو روح بن کے رہے بانسری میں دہقاں کی شرابِ ناب میں جسطرح کیف کے اثرات
غرضکہ فلسفہ مجروحِ انقلاب ہوا
فضائے روح میں نغمہ مئے شباب ہوا

(۳)

عقل کو سمجھا ہے تو اسرارِ عالم پر محیط
میں تجھے پیغام دیتا ہوں کہ غافل ہوشیار!
تیری منزل ہے رہینِ ظلمتِ وہم و قیاس
خود حجابِ دید ہے جس میں جمالِ آشکار
تو نے یونہی کی ہے موجوداتِ عالم پر نظر
اے رہینِ شبنم و نا واقفِ ابرِ بہار
دیکھتا ہو خواب سے جس طرح کوئی چونک کر
جس کی آنکھوں میں ہو گہری نیند کا باقی خمار
جس کو دھندلے سے نظر آئیں مناظر گرد و پیش
اور اس موہوم بینش پر ہو اس کو اعتبار

(۴)

تجھ کو ہے اس میں تلاشِ جلوۂ تسکینِ روح
بے خبر! دنیا ہے اک ہنگامہ زارِ اضطراب
گُم ہوئے ہیں اس خلا میں آہ کتنے کارواں
جن کی گردِ راہ ہے اب تک رہینِ پیچ و تاب
یہ لطائف یہ مناظر یہ بہشتِ آب و رنگ
خندۂ آزادِ طفلی جلوۂ حُسنِ شباب
جن کے سائے میں نمو پاتی ہے تیری آرزو
صبح کے آغوش میں جیسے شعاعِ آفتاب
زندگانی موت کا احساس کھو سکتی نہیں
اِن سے تیری روح کی تسکین ہو سکتی نہیں

(۵)

فضائے ہستیٔ فانی ہے اس قدر تاریک
کہ سرنگوں نظر آتی ہے عقلِ انسانی

وصالِ ماہ کی خواہش میں جیسے دریا کی ہر ایک موج ہو زحمت کشِ پرافشانی
اسی طرح سے ہر انساں کی روحِ غمگیں پر ازل کے روز سے چھائی ہوئی پریشانی
سکون اس کو مگر ہمنشیں نہیں ملتا
وہ ماہ جس کی طلب ہے کہیں نہیں ملتا

(۶)

سرودِ خیر سے کچھ کم نہیں نشاط انگیز نوائے بربطِ شر یا ترانۂ عصیاں
عجیب مجمعِ اضداد ہیں اصولِ حیات فضائے عیش کے سینے میں جوئے غم ہے رواں
ملی ہوئی ہیں حدیں اس قدر کہ کیا کہیے یہ ایک ساز کے نغمے ہیں "دو" یقین و گماں
اسی طرح سے نظر آزما ہے ظلمتِ شب
ضیائے مہر بصارت پہ جس طرح ہو گراں

(۷)

ختم سمجھا تو نے غافل شمع کا دورِ حیات وہ ہوئی مہرِ مبیں میں جذب ہو کر جلوہ گر
طالبِ غور و تامل ہیں اصولِ کائنات سطح کے جلووں میں ہے الجھی ہوئی تیری نظر
زندگی قطرے کی دریا سے جدا ہوتی نہیں
شمع بجھ تو جاتی ہے لیکن فنا ہوتی نہیں

(۸)

گرچہ ہے انسان یوں بننے بگڑنے کے لئے
راستے پر جس طرح بکھرے ہوئے نقشِ قدم
نالۂ بیتاب ہو یا نغمۂ رنگیں سرشت
آسمانوں کی فضا میں ہو کے رہتے ہیں بہم
آہ اس دنیا کا ہر جلوہ ہے کتنا ناتمام
پھر بھی کی جاتی ہے ہم سے خواہشِ نقشِ دوام

(۹)

مٹ کے یوں رہ گیا ہوں میں اخترؔ
ذہن میں جیسے نقشِ عہدِ کہن
زندگی خواب تھی سراپا خواب
اور وہ بھی مہیب و صبر شکن

متفرقات

بیٹھا ہوں انتظارِ اثر میں دعا کے بعد
اس حُسنِ اعتماد کے قربان جائیے

آشیاں اُجڑا نہیں فصلِ بہار آئی نہیں
کیوں ابھی سے ہوں خدایا میں اسیرِ دامِ غم

دل کے خوں ہونے پہ جن کی آنکھ شرمائی نہیں
میری مرگِ ناگہاں کا کیا انھیں ہوگا ملال

اے کاش میں اسیر نہ ہوتا بہار میں
شعلے سے اُٹھ رہی ہیں دلِ بے قرار میں

عشق نے یہ رنگ اڑایا ہے غمِ ایام سے
زندگی سرشار کیوں ہوتی مئے اوہام سے

یہ طلسمِ رنگ و بو آزاد ہے الزام سے
میں نے خود پھندے لگائے ہیں ہوا خود ہی اسیر

اک صبر شکن احساس ملا اک درد بھری تقدیر ملی
جو خواب ازل میں دیکھا تھا اس خواب کی یہ تعبیر ملی
ہنستی ہوئی کلیوں کے رُخ سے اٹھے جو تبسم کے پردے
حسرت ہی کا اک عالم دیکھا عبرت ہی کی اک تصویر ملی

مرے عیش رنج کو واسطہ غمِ دہر و عشرتِ عام سے
مری زندگی تری یاد میں مری سرخوشی ترے نام سے
وہ غرورِ ہوش کدھر گیا نگہِ زمانۂ خام سے
تری ایک جنبشِ چشم میں تری ایک گردشِ جام سے

یاس کی رو میں نورِ عشق ظلمتِ روح بن گیا
صبح نے یا بجھا دیا شعلۂ شمعِ خاوری

سحر کا وقت ہے ہنستی ہیں کلیاں صحنِ گلشن میں
نہ جانے کیوں مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں
دمِ عرضِ جفا مجبوریٔ فطرت کو کیا کہیے
جھکی پڑتی ہیں نظریں خود بخود شرمائے جاتے ہیں

یہ میں نے مانا کہ خاک تک بھی مری نہ اے آسماں رہیگی
مگر طرازِ کتابِ عبرت ستم کی اک داستاں رہیگی
تجھے ہی کیوں رنجِ نامرادی کہ دل ہی لبریزِ درد تیرا
ہزار ہو صرفِ ناشناسی یہ جنس پھر بھی گراں رہیگی

سرِ بزمِ ناز پیامِ دل بجز اک نگاہ ادا نہ کر
کہ خطا ہے جنبشِ لب یہاں یہ مقامِ راز و نیاز ہے

یہ وفورِ دردمندی یہ ہجومِ ناتوانی ہمہ تن حدیثِ غم ہوں نہ زباں نہ بے زبانی
جو حریفِ ہر سکوں ہو وہ نگاہ چاہتا ہوں کہ اسی پہ منحصر ہے مرے دل کی زندگانی

فطرت نے اسرار کے رخ پر عقل کے پردے ڈالے ہیں
خود نہ شناسی نام ہے جس کا اصل میں ہوش پرستی ہے

وہ شوقِ وصل و شکوۂ بیتابیٔ فراق مدت سے تھا جو دل میں نہاں بر ملا ہے آج
وہ جلوۂ حیات کہ از راہِ سوزِ غم برسوں سے تھا جو صبر شکن جاں فزا ہے آج

ہر نقش دل پذیر ہے ہر رنگ دلفریب   عشرت کی اے ندیم کوئی انتہا ہے آج

اخترؔ خدا کی شان کہ وہ نو بہارِ ناز

مجھ سے سیاہ روز کا مہماں ہوا ہے آج

جنبشِ پردۂ رباب پردہ کشائے راز ہے

نغمہ ہے اے خدا کہ یہ موجِ نوائے راز ہے

غور سے دیکھ صبح ہے حسنِ نہاں کا آئینہ

غور سے سن سکوتِ شام نغمہ سرائے راز ہے

نگاہوں کا ٹھہرنا شوق کا مجبور ہو جانا

ترا ہر عالمِ قربت ہے تجھ سے دور ہو جانا

ہلکی سی شکن ہے ماتھے پر دھیما سا تبسم ہونٹوں پر

اس حسنِ ادا کا کیا کہنا احساس بھی ہے پندار بھی ہے

آنکھوں سے ہٹ رہے ہیں نظر آزما حجاب

بے پردہ رازِ ہستیٔ کون و مکاں ہے آج

بے خوف جا رہی ہے مری کشتیٔ مراد

وہ نا خدا ہیں پرتوِ مئے بادباں ہے آج

ہے وہ فضا کہ لالہ فشاں ہے ضمیرِ خاک
ہے وہ سماں کہ پیرِ دوتا بھی جواں ہے آج
اختر یہ بزمِ عیش یہ ساقی یہ دورِ جام
زندہ ہوں میں ابھی یہ مجھے بھی گماں ہے آج

اے وہ کہ تری ہر ایک ادا سرمایۂ کیف و مستی ہے
فریاد کہ دلِ نازک ہی بہت یاں درد کی دنیا بستی ہے
یہ جلوہ گہِ ہستی کیا ہے میں دیکھ کے جس کو حیراں ہوں
بیدار ہے میری نظروں میں وہ حسن جو رازِ ہستی ہے

مئے تو ہے حدِ تشنگی نہ سہی
میری قسمت میں بے خودی نہ سہی
موت انجامِ زندگی نہ سہی
خیر اب یہ امید بھی نہ سہی

یہ بھی کہیں بجھ کے رہ نہ جائے
میں ہوں اور شمعِ بیکسی ہے

آ پہنچی ہے جان کی خرابی
اے عشق! نویدِ کامیابی
ہستی ہے فقط فریبِ ہستی
کہتا تھا یہ بات اک شرابی
ہر ذرہ ہے اک محیطِ انوار
اللہ رے اُن کی بے حجابی

چند دن اور جو دنیا میں گزارا ہوتا
مجھ کو اس دشمنِ احساس نے مارا ہوتا
کچھ تو ملتی غمِ محرومیٔ جاوید کی داد
درد ہی کا دلِ بے کس کو سہارا ہوتا

ہر پھول میں مسکرا رہی ہے میری ہی نگاہ کی جوانی

اللہ مری مجبوریٔ دل اک وہم سا ہے آزادی کا
اک حسرت ہے آبادی کی اک عالم ہے بربادی کا

سمجھ میں آ گیا مفہوم اب دنیائے فانی کا

مری آنکھیں کھلیں اسرارِ غم سے آشنا ہو کر
خدا شاہد بھنور میں ڈوب جانا اس سے بہتر ہے
اگر ساحل ملے منت پذیرِ ناخدا ہو کر

بیگانۂ شوقِ جلوہ گری وہ حسنِ خود آرا ہو نہ سکا
آئینے سے نظریں ہٹ نہ سکیں آئینے سے پردا ہو نہ سکا
آدابِ محبت کیا کہیے سینے ہی میں آنسو بھی کھٹکے
یاں جنبشِ لب تو ایک طرف آنکھوں سے بھی شکوہ ہو نہ سکا

ڈوبنے میں میری خودداری کا عالم دیکھ کر
مسکرایا اور خود گرداب ساحل ہو گیا

مری طرف مسکرا کے دیکھا کچھ اس طرح بے حجاب تو نے
کہ ذرہ ذرہ کو اس جہاں کے بنا دیا آفتاب تو نے

سپاسِ اہلِ نظر ادا کر کہ بن گئیں پردہ دار نظریں
حجاب ٹوٹا تو اور پایا لطیف تر اک حجاب تو نے

گذر چکی ہے ہزارہا گردشوں سے تعمیرِ زندگانی
تڑپ رہا ہے ضمیرِ ہستی میں آج بھی شعلۂ جوانی

سحر ہوئی پھول مسکرائے مگر نظر ہے اداس ان کی
کسی نے شاید شبِ گذشتہ انھیں سنا دی مری کہانی

تشنۂ زخم ہوں ابھی مجھ پہ کرم نہ کیجئے   تیرِ ستم لگائیے ترکِ ستم نہ کیجئے

ہماری زندگی کیا موت کیا ہے یہ جہاں کیا ہے
کہوں کس سے کہ میرے دل میں اک طوفان بپا ہے

ہر راز کو سمجھا ہے ہر رنگ کو چھانا ہے
ہم نے اسے مانا ہے اور دیکھ کے مانا ہے

میں حاصلِ ہستی سمجھوں گا میں غم کی تلافی سمجھوں گا
بن جائے اگر درسِ عبرت افسانہ مری بربادی کا

موت کا راز جان لے کاش یہ ناتمامِ شوق
دل، کہ ہے صرفِ جستجو عمرِ دراز کے لئے

گذر چکا ہے یقیں کی حدوں سے پیکِ خیال ہنوز کشمکشِ احتمال باقی ہے
اگرچہ ٹوٹ چکا ساغرِ عروسِ بہار ہنوز مستیٔ بادِ شمال باقی ہے
اگرچہ ہے متبسم ستارۂ سحری ابھی تصورِ شامِ وصال باقی ہے

غور سے دیکھ اے دیدۂ عبرت حسنِ سکوں ویرانوں کا
دانشِ حیراں ڈھونڈھ رہی ہے نقشِ قدم دیوانوں کا
سوزِ محبت یکساں تھا وہ خاک ہوئے یہ خون ہوا
دل ہی کی یہ ہمت تھی یہ کام نہ تھا پروانوں کا۔
گیتی کے نظارے گم ہیں حسنِ ازل کے جلووں میں
ہستی اک مجموعہ ہے کچھ بھولے ہوئے افسانوں کا

ننگ ہے اے نگہہِ شوق وہ نظارۂ حسن آپ جب تک نہ ہو مجبور تماشا کوئی
تا حدِ یاس کوئی محوِ تمنا جائے ایسے جینے سے تو اچھا ہے کہ موت آ جائے
میکشو چھیڑ دیا صبح نے افسانۂ ہوش محفلِ عیش سے اب بادہ و مینا جائے
درسِ ہمت ہے ہر اک پھول میں اے ذوقِ حیات کہ ہم آغوشِ فنا بھی ہو تو ہنستا جائے
اور بڑھ جائے گی تدبیر سے بیتابیٔ دل چارہ فرما مری بالیں سے خدارا جائے

ہر حلقہ اک دام بلا ہے دوش پہ بکھرے ہوئے بالوں کا
صید کہیں بچ سکتا ہے ان کافر گیسو والوں کا

موت نے دل کے عقدے کھولے اب انجام نظر آیا
آزادی کے خوابوں کا آسائش کے خیالوں کا
خونِ جگر آنکھوں سے بہانا جیتے جی ہی مرجانا
اور مآلِ ہستی کیا تھا اختر سے بے حالوں کا

زمیں سے تا اوجِ بامِ گردوں بس ایک آواز گونجتی ہے
مگر یہ اے سحر سازِ مطرب عجیب چھیڑا رباب تو نے
بہت ہے موجِ نسیم تجھ کو اگرچہ پندارِ دلکشائی
تجھے خبر ہے کہ توڑ ڈالے بنا کے کتنے حباب تو نے

گردشِ رنگ سے مجبور ہے آئینِ بہار
وقت کے ساتھ گیا ساغر و مینا اپنا
ڈوبنے پر بھی یہ احساس ہے کتنا ہمہ گیر
موج اپنی ہی حباب اپنا ہے دریا اپنا

زندگی کو ملا نہ درسِ کمال
گو فریبِ کمال میں گذری

عشق شرمندۂ فغاں نہ ہوا
زخم دل پر لگا گراں نہ ہوا
ہو نہ جس کا مآل حسرت و یاس
کوئی عشرت کا وہ سماں نہ ہوا
اس نے وعدہ کیا وفا نہ کیا
مہرباں ہو کے مہرباں نہ ہوا
کون دنیا میں خوش نہیں اختر
صرف اک میں کہ شادماں نہ ہوا

کچھ نہیں درد کی دوا معلوم — رازِ ہستی ہے رازِ نا معلوم

زلفیں رُخِ جاناں پہ ہیں لہرائی ہوئی سی
یا ہے سرِ میخانہ گھٹا چھائی ہوئی سی
کیا قہر ہیں ان کی غلط انداز نگاہیں
پیہم نظر آتی ہے قضا آئی ہوئی سی

لذّتِ دیدار میں گم ہو گئے — ان کو جب پایا تو ہم خود کھو گئے
موت آئی خوابِ شیریں کی طرح — ہم نے آنکھیں بند کیں اور سو گئے

دل نے سمجھا کر اسے رازِ جمال — اور خود بین و خود آرا کر دیا

نہ جانے اشارے سے کیا کہہ گئے — وہ میری طرف دیکھ کر رہ گئے

کس نے پائی ہے وہ نگاہِ تلاش — جو تری دید کو ترستی ہے

ان سے اب نامہ و پیام کہاں — وہ محبت کا اہتمام کہاں
تم سے چھٹ کر دماغِ عیش کسے — اب وہ محفل وہ دورِ جام کہاں

کھنچ کر آئے نہ قفس تک غنچے — اثرِ نالۂ بلبل کیا ہے

ختم کر داستانِ غم اختر — حال تیرا سنا نہیں جاتا

صلۂ درد کس نے پایا ہے — اپنی ہستی مٹائے جاتا ہوں

بہ ہزار موجِ نشاط ہے وہی شانِ مشتِ غبار کی
یہ فریبِ گردشِ رنگ ہے کہ تجلیاں ہیں بہار کی

نغمۂ لطیف تر سہی ذوق تو ہو ادا شناس
زخمۂ روح چاہیے جنبشِ ساز کے لئے

قفس میں آج یادِ آشیاں بے اختیار آئی
مبارک ہمصفیرو دیکھنا شاید بہار آئی

پہنچ کر تا درِ تاثیر کس کو باور آئے گا
مگر سچ جانیے میری دعا ناکامگار آئی

ہوئے افسردہ جو میرے نشیمن کی تباہی پر
مجھے ان سطح بینوں پر ہنسی بے اختیار آئی

دردِ غیروں کا بھی سنتا ہوں تو میں خوگرِ درد
یہ سمجھتا ہوں کہ ہے یہ بھی حکایت میری

چاک ہونے کو ہے اب پردۂ اوہامِ مجاز
ہے نظر جانبِ اسرارِ حقیقت میری

دل میں جو آگ بھری ہے نہیں چھپتی اختر
میری آنکھوں سے چھلک پڑتی ہے حسرت میری

ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں، دم نکل جانے کو ہے
اور میں خوش ہوں کہ پیغامِ سکوں آنے کو ہے

میری محرومی ہے ساقی ایک دردِ بے دوا
یہ مری قسمت کی گردش ہی جو پیمانے کو ہے

زندگی کے نام سے جو چبھ رہا تھا روح میں
آج اخترؔ دل سے وہ کانٹا نکل جانے کو ہے

کس زباں سے ہو سپاسِ وحشتِ عقل آزما
جس نے سمجھائی یہاں اسرارِ دانائی مجھے
آرزو تو کیا برآئی کچھ سکوں سا ہو گیا
وہ تو کیا آئے شبِ غم، ہاں اجل آئی مجھے

عشق کے مشرب میں اخترؔ کفر تھا احساسِ غیر
حُسن آخر کر گیا میرا تماشائی مجھے

نہ شغل ہے بادۂ طرب کا، نہ زہرِ غم ہے کہ پی رہا ہوں
کوئی بتائے کہ میں سیاہ روز مر چکا ہوں کہ جی رہا ہوں

نہ پوچھ مجھ سے زمانہ گیا ہے اب اس قدر یاد رہ گیا ہے
اِسی میں کچھ دن ندیم میں بھی ستم کشِ بیکسی رہا ہوں

چمن کے دیرینہ کار مجھ کو نیا سمجھ کر نہ مسکرائیں
کہ میں بھی اک عمر آشنائے ترانۂ سرخوشی رہا ہوں

عبرتِ افسانہ بن کر رہ گئی ہر کائنات
بے خبر سمجھا ہے اک افسانۂ عبرت اسے
محرمی پر بھی ہے چشمِ شوق محرومِ جمال
کاش یوں ملتی نہ اخترؔ دید کی طاقت اسے

میری نظر میں نہاں روح کی افسردگی
میری جبیں پر عیاں قلب کی ویرانیاں
کاش کبھی پا سکیں رازِ مئے بے خودی
عقل کی بے راہیاں، ہوش کی نادانیاں

دل ہے ترا آئینہ، دل سے نگاہوں کو ربط   تیری تمنا کا راز ہیں مری حیرانیاں

شاید اپنے دردِ پنہاں کا اثر پاتا ہوں میں
کوئی روتا ہو مگر غم سے تڑپ جاتا ہوں میں
کون آتا ہے کہ آنکھوں میں کھنچی آتی ہے روح
خود بخود کیوں آج سجدے میں گرا جاتا ہوں میں
رو رہی ہے شمعِ سوزاں، ہنس رہے ہیں اہلِ بزم
ہر خوشی میں درد و عبرت کی جھلک پاتا ہوں میں

لے کے آئی تھی عدم سے میری نادانی مجھے   اب کہاں لے جائے دیکھوں ہستیٔ فانی مجھے
یونہی آیا تھا غمِ پنہاں کی تسکیں کا خیال   کیا کہوں کیا کیا ہوئی دل سے پشیمانی مجھے
اخترؔ اس عقلِ غلط اندیش کو اب کیا کہوں   بن گیا عنوانِ مشکل وہم آسانی مجھے

لہو دل کا اب آنکھوں سے رواں بھی دیکھتے جاؤ
مٹایا ہے تو مٹنے کا سماں بھی دیکھتے جاؤ
عیادت کے لئے آئے ہو گر بیمارِ ہجراں کی
تو حدِ کاوشِ دردِ نہاں بھی دیکھتے جاؤ
رہینِ آشیاں دیکھا، اسیرِ دام بھی دیکھو
مآلِ آرزوئے آشیاں بھی دیکھتے جاؤ

جہاں صرفِ احساسِ مجبور ہے
کُھلا جب سے دنیائے فانی کا راز
زمانہ ہے صرفِ رسوم و قیود
سکوں بزمِ گیتی میں اختر کہاں

ابھی منزلِ آگہی دور ہے
نہ مایوس ہے دل نہ مسرور ہے
حقیقت نگاہوں سے مستور ہے
مقدر نہیں گرچہ مذکور ہے

حسرت و عبرت کی اک دنیا قبر پہ میری روئے گی
ایک جہانِ یاس و تمنا میری لاش اٹھائے گا
یونہی سہی اسرارِ نہاں کے رُخ سے نقاب اُٹھ جانے دے
تو بھی اے پندارِ حقیقت کچھ دن میں شرمائے گا

کون کہتا ہے گل و لالہ ہیں اجزائے بہار
کچھ مرے دل ہی کے ٹکڑے تھے کہ افسانہ بنے

وہ شامِ وصل عشرتوں کا اک جہاں لئے
وہ موج مے ہزار ہا تجلیاں لئے ہوئے

ادا سپاسِ دردِ کر نشاطِ روزگار کیا
بہار بھی ہے دامنوں میں بجلیاں لئے ہوئے

ہوش آزما جو نرگسِ مستانہ ہو گئی
دنیا تمام پرتوِ میخانہ ہو گئی

جہاں ہے اک افسانۂ دلفریب
سبھی کچھ ہے لیکن حقیقت نہیں

اگر ہے منزل رسی کی خواہش تو ہمتِ دل کو رہنما کر
کہ جادۂ کاروانِ رفتہ سے اُٹھ سکیگا غبار کب تک

رباعیات

شہرت کے لئے جہاں میں لڑنے والو
احباب سے بے وجہ جھگڑنے والو
اس پستیٔ فطرت کی نمائش کب تک
ادنٰی سی نمود پر اکڑنے والو

(۲)

مذہب کے مخالف ہیں جو خود ہیں اطفال
سمجھے بھی ہیں تنظیمِ حقایق کا سوال
ظاہر میں یہ کہنا تو ہے آسان بہت
مذہب اک وہم اور خدا محض خیال

(۳)

سرنامۂ ہر دفترِ عصیاں ہو جائے
سرحلقۂ ہر محفلِ عرفاں ہو جائے
مجبورئ انساں ہے بہر حال عیاں
پیغامِ سکوں بنے کہ طوفاں ہو جائے

(۴)

ہر ایک کو شکوہ سنجِ مشکل پایا
خونابۂ دل آنسوؤں میں شامل پایا
دیکھا نہ کسی کو آشنائے منزل
سب کو سرگرمِ شوقِ منزل پایا

(۵)

تاریک ہے بزمِ زندگانی میری
بے نور ہے صبحِ شادمانی میری
ناواقفِ اسرارِ طرب ہے ہمدم
پیری سے ضعیف تر جوانی میری

(۶)

مطلب یہ نہیں تباہِ عصیاں ہو جائے
اور یہ بھی نہیں کہ صرفِ عرفاں ہو جائے
دنیا کو فرشتہ ہے نہ شیطاں درکار
انساں کو لازم ہے کہ انساں ہو جائے

(۷)

ہر سانس کے ساتھ زہرِ غم پیتا ہوں
آہیں کر کر کے زخمِ دل سیتا ہوں
جینا ہے اگر سانس کے چلنے کا نام
مجھ کو بھی یقین ہے کہ میں جیتا ہوں

۸

احساسِ گناہ و رنجِ عصیاں کب تک
محرومِ نشاط و وقفِ حرماں کب تک
مئے پی کہ حجاباتِ نظر ٹوٹ سکیں
نامحرمئ رموزِ عرفاں کب تک

(۹)

سرگرمِ نشاط و شادمانی ہو جا
آ محرمِ رازِ کامرانی ہو جا
ہستی کا پیام ہے کہ لازم ہے فنا
کہتی ہے یہ موت جاودانی ہو جا

(۱۰)

کہہ سکتے ہو تم کہ روح بیدار نہیں
پھر کون ہے ایسا کہ خطاکار نہیں
فطرت نے سکھائے ہمیں اندازِ گناہ
معصوم ہیں سب کوئی گنہگار نہیں

(۱۱)

اے دوست گوارا ہے تجھے بھی یہ ننگ
تو اور یہ نامحرمیٔ گردشِ رنگ
غافل اُمید و ناامیدی کیسی
ہمت پہ تری عرصۂ آفاق ہے تنگ

(۱۲)

مقصودِ حیات ہی فنا ہے اِن کا
آغاز برنگِ انتہا ہے اِن کا
کرتے ہیں یہ انکارِ خدا تو لیکن
ہر ذرۂ ناچیز خدا ہے اِن کا

(۱۳)

تو روح کے اسرار کا قائل ہی نہیں
کیا کہیے کہ سینے میں نرا دل ہی نہیں
تو جلوۂ حسنِ سرمدی ہے لیکن
آئینہ ابھی تیرے مقابل ہی نہیں

(۱۴)

مطلوب ہے ظرف رازِ عرفاں کے لئے
دل چاہیے انوارِ فراواں کے لئے
آنکھیں ہوتیں تو دیکھ سکتا تو بھی
آئینہ ہے روحِ حسن پنہاں کے لئے

۱۵

بھولے ہوئے خواب پھر دکھا دیتا ہے
ہستی کو نگاہوں سے گرا دیتا ہے
غمگینیٔ فطرت سے ہوں مجبور، مجھے
پھولوں کا تبسّم بھی رُلا دیتا ہے

(۱۶)

حیراں ہوں کہ یہ عالمِ اسرارِ وجود
سرشارِ مئے معرفتِ غیب و شہود
خود اپنی حقیقت سے بھی آگاہ نہیں
طوفاں بہ کنار اور اتنا محدود

۱۷

آتی ہے نظر اصلِ گل و خار تجھے؟
معلوم ہیں اس خاک کے اسرار تجھے؟
ظاہر پہ تو ایمان ہے تیرا، لیکن
حیراں ہوں کہ باطن سے ہے انکار تجھے

(۱۸)

بے چین رہے جائیے، جب تک دم ہے
عالم ہے کہ اک سلسلۂ برہم ہے
یہ عیش و نشاط و شادمانی سب وہم
جو کچھ ہے متاعِ زندگانی غم ہے

۱۹

ہر چند کہ رسمِ جستجو جاری ہے
انجام جو پوچھو تو وہی خواری ہے
اتنا بھی تو آج تک نہ معلوم ہوا
یہ خواب کا عالم ہے کہ بیداری ہے

(۲۰)

غافل یہ تلاشِ کامرانی کیسی
پیری کی نقیب ہے جوانی کیسی
ہر سانس میں ہے کشمکشِ موت و حیات
جینا ہے یہی تو شادمانی کیسی

۲۱

سرمایۂ اخلاقِ زبوں کاری ہے
اِک کھیل زمانے کا دل آزاری ہے
جس علم سے حاصل نہ ہو عرفانِ حیات
وہ علم بھی اک طرح کی بیماری ہے

(۲۲)

چوکھٹ پہ کسی کی سر جھکایا نہ گیا
حالِ دلِ محروم سنایا نہ گیا
اغیار تو اک طرف کہ اخترؔ مجھ سے
احباب کا احساں بھی اُٹھایا نہ گیا

(۲۳)

آسان نہیں جہل کا عرفاں ہونا
رِستی ہوئی اک موج کا طوفاں ہونا
گہرا ہے بہت فریبِ علم و دانش
انساں کو بھی حاصل نہیں انساں ہونا

(۲۴)

تحقیق بعنوانِ زیاں کاری ہے
ہم خواب کو سمجھے ہیں کہ بیداری ہے
ڈوبی ہوئی ہیں علم و یقیں کی نبضیں
پیشانیٔ دانش سے لہو جاری ہے

(۲۵)

محشر کدۂ حیاتِ فانی کیا ہے
فانی ہے کہ ہے یہ جاودانی کیا ہے
اُٹھتا ہی نہیں نقابِ روئے اسرار
یارب! یہ طلسمِ زندگانی کیا ہے

(۲۶)

عرفانِ حیات و کامرانی کیا ہے
احساسِ نشاط و شادمانی کیا ہے
او خلوتِ دل میں چھُپ کے رہنے والے
کہہ دوں کہ حجابِ زندگانی کیا ہے

(۲۷)

پردوں میں حقیقت کو چھپایا تو نے
خوابیدہ نگاہوں کو جگایا تو نے
ہر ذرّے کو احساسِ بصیرت دے کر
انکار کی مشعل کو جلایا تو نے

(۲۸)

ہر رنگ میں حُسنِ شادمانی ہے وہی
ہر سانس میں لطفِ کامرانی ہے وہی
صد شکر کہ باوجودِ آلامِ حیات
پیری میں بھی احساسِ جوانی ہے وہی

(۲۹)

تاریکیٔ صنعت میں چھپا جاتا ہے
انوارِ حقیقت سے پھرا جاتا ہے
اللہ رے طفلانہ مزاجی تیری
مٹّی کے کھلونوں پہ مٹا جاتا ہے

(۳۰)

ہر حال میں، ہر آن لڑے جاتا ہے
ہر رنگ سے نادان لڑے جاتا ہے
اس عہد کا انساں ہے مکمل حیوان
حیوان سے حیوان لڑے جاتا ہے

(۳۱)

گُم کردۂ پندار نظر آتا ہے
نامحرمِ اسرار نظر آتا ہے
عامی ہو کہ ہو عارفِ پاکیزہ جمال
اس عہد میں بیمار نظر آتا ہے

(۳۲)

اک جہلِ بسیط رازِ دولت پایا
ہر گام پہ اک منظرِ عبرت پایا
قربان ہو جس پہ کبریائی سو بار
اوچھوں کا وہ پندارِ حکومت پایا

(۳۳)

ہر چند کہ حشرِ جستجو برپا ہے
ہستی کا کوئی راز نہ سمجھا گیا ہے
مجموعۂ ذرّات ہے دنیا، لیکن
ہر ذرّہ بجائے خود بھی اک دنیا ہے

(۳۴)

کھلتے ہیں نگاہوں پہ جب اسرارِ وجود
سایہ نظر آتی ہے یہ تعمیرِ شہود
اک جلوہ پسِ پردہ ہے سرگرمِ طپش
زندہ ہے یہاں کوئی نہ کوئی موجود

(۳۵)

محرومیٔ دل پہ رو رہا ہوں ساقی
یا تخمِ امید بو رہا ہوں ساقی
دُنیا کیا ہے، حیاتِ دُنیا کیا ہے
بیدار ہوں میں کہ سو رہا ہوں ساقی

(۳۶)

یہ عالمِ قحطِ علم و دانش کیا ہے
افسانۂ ناتمامِ بینش کیا ہے
بالفرض کہ آغاز ہے یہ وہمِ وجود
اللہ! مآلِ آفرینش کیا ہے!

(۳۷)

دیکھے ہیں نگاہوں نے تماشے کیا کیا
دُنیا میں دئیے جاتے ہیں دھوکے کیا کیا
اُجلے کپڑوں میں مرغِ زریں کی طرح
پھرتے ہیں اکڑتے ہوئے سفلے کیا کیا

(۳۸)

ناکامِ ازل ہوں، غم ہی سہنے دے مجھے
طوفانِ سکوں رُبا میں بہنے دے مجھے
اے کاش کہ تو محرمِ اسرار نہ ہو
جس حال میں ہوں ندیم! رہنے دے مجھے

(۳۹)

ناداں ہیں جو مُجرم کو سزا دیتے ہیں
آئینِ حقیقت کو بُھلا دیتے ہیں
تجویزِ سزائے جرم کرنے والے
خود اپنی ہی فطرت کو دغا دیتے ہیں

(۱۴۰)

یوں تو ادب و شعر میں یکتا ہیں جناب
ہیں منطق و حکمت میں بھی آپ اپنا جواب
اور اِن کو ٹٹول کر جو دیکھے کوئی
جاہل نظر آئیں گے، برافگندہ نقاب

"خاتمہ"

محبّت کے اسرار سمجھا رہا ہوں　　تڑپ کر زمانے کو تڑپا رہا ہوں
جنوں کے لطیف و سبک بازوؤں پر　　حقیقت کی جانب اُڑا جا رہا ہوں
نشیب و فرازِ رہِ زندگی کو　　پھر اک سطحِ ہموار پر لا رہا ہوں
چھڑا تھا جو نغمہ دمِ آفرینش　　اُسے ہر نفس میں نہاں پا رہا ہوں
خِرد نے سنوارا ہے زلفوں کو جس کی　　میں اس حُسنِ مستی پہ اِترا رہا ہوں
بڑے لطف کا ہے فسانہ یہ دُنیا　　سمجھتا ہوں دھوکے مگر کھا رہا ہوں
پھر اجزائے ہستی کی بیداریوں سے　　جبینِ حقائق کو چمکا رہا ہوں
وہ گُم کردگانِ رہِ عقل و دانش　　اُنھیں اصل مرکز پہ اب لا رہا ہوں
مجھے روک سکتا ہے سیلِ حوادث!　　چلا جا رہا ہوں بڑھا جا رہا ہوں
مرا عالمِ کیف! کیوں کر بتاؤں　　کہ میں فرش سے عرش تک چھا رہا ہوں

کہاں میں کہاں دہرِ فانی یہ اخترؔ
بہت اپنی حالت پہ شرما رہا ہوں

(کاتب الحروف شاہ آبادی)

غزلوں کی سنہ وار فہرست